الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

خوش فہم آدمی اکثر ایک ایسے سفر کے اختتام کا
انتظار کرنے لگتا ہے جس کا ابھی تک اس نے
آغاز بھی نہیں کیا ہے ——————

شمارہ ۵۴
مئی ۱۹۸۱

زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے
بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی

قیمت فی پرچہ
دو روپے

الرسالہ

مئی ۱۹۸۱
شمارہ ۵۴

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دھلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اعلان

ادارہ الرسالہ کی طرف سے جس اجتماع کا اعلان اس سے پہلے کیا گیا تھا، اس کی تاریخیں ملتوی ہوگئی ہیں۔ اس سلسلے میں تفصیلات کے لئے آئندہ اعلان کا انتظار فرمائیں۔

لوگ ہم سے پروگرام پوچھتے ہیں۔ فی الحال ہمارا پروگرام صرف یہ ہے کہ الرسالہ کی آواز کو عام کیا جائے جس کی بہترین صورت ایجنسی ہے۔ جو لوگ الرسالہ کے مشن سے متفق ہوں ان سے ہماری گزارش ہے کہ وہ الرسالہ کی ایجنسی لے کر اس کو اپنے ماحول میں زیادہ سے زیادہ پھیلائیں۔ یہی اس وقت ہمارا پروگرام ہے۔

منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ تحریر فرمائیں۔ ہر خط و کتابت کے ساتھ خریداری نمبر یا ایجنسی نمبر کا حوالہ ضرور دیں

خدا کی عینک سے

اگر آپ صاف شیشہ کی عینک لگائیں تو ہر چیز آپ کو اپنے اصلی رنگ میں دکھائی دے گی۔ لیکن اگر آپ کی آنکھ پر رنگین شیشہ والی عینک ہو تو ہر چیز کا رنگ مصنوعی ہو جائے گا۔ اب ہر چیز آپ کو اس رنگ میں رنگی ہوئی دکھائی دے گی جو کہ آپ کی عینک کا رنگ ہے۔

یہی حال انسانی ذہن کا ہے۔ ہر آدمی جب دوسرے کو دیکھتا ہے تو وہ اس کو اپنے ذہن کی "عینک" سے دیکھتا ہے۔ اگر اس کی عینک کا شیشہ صاف ہے تو ہر چیز اپنے اصلی رنگ میں دکھائی دے گی۔ اور اگر اس کی عینک کا شیشہ رنگین ہو تو کوئی چیز خواہ حقیقت میں کیسی ہی ہو، اس کے اپنے دیکھنے میں ویسی ہی دکھائی دے گی جیسا کہ اس کی اپنی عینک کا رنگ ہے۔

آدمی کا ذہن یا تو خدائی ذہن ہوتا ہے یا ذاتی ذہن۔ وہ دوسروں کو یا تو خدا کی عینک سے دیکھتا ہے، یا اپنی ذاتی پسند کی عینک سے۔ یہ دونوں طریقے ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ خدا کی عینک سے دیکھنے والا دوسروں کو حقیقت واقعہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے نہ کہ اپنی متاثر نگاہ سے۔ وہ ہر آدمی کو ویسا ہی دیکھتا ہے جیسا کہ وہ فی الواقع ہے۔ کیونکہ خدا کے دیکھنے کا طریقہ یہی ہے۔ مگر دوسرے آدمی کا طریقہ اس سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ ہر آدمی کو اپنے مفاد اور اپنی عصبیت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ جس آدمی سے اس کی دوستی ہے وہ اس کو اچھی صورت میں دکھائی دیتا ہے اور جس سے اس کا بگاڑ ہے وہ بری صورت میں۔ جو آدمی اس کے اپنے حلقہ کا ہے وہ اگر اس کو "سفید" نظر آئے تو دوسرے حلقہ کا آدمی اس کو "کالا" نظر آتا ہے۔

مومن وہ ہے جو ہر آدمی کو خدا کی نگاہ سے دیکھے نہ کہ اپنی ذاتی نگاہ سے۔

جو شخص چیزوں کو خدا کی نظر سے دیکھنے لگے وہ ایک بے پناہ انسان بن جاتا ہے۔ کیونکہ وہ ہر ایک سے وہی معاملہ کرتا ہے جو باعتبار واقعہ اسے کرنا چاہئے۔ وہ دنیا کے لحاظ سے ایک حقیقت پسند انسان بن جاتا ہے اور آخرت کے لحاظ سے ایک صالح انسان۔

قبر نہیں دروازہ

"حافظ جی کے لڑکے کا انتقال ہوگیا ہے۔ جنازہ کی نماز تیار ہے۔ میں آپ کو بلانے کے لئے آیا ہوں" یہ سنتے ہی میں نے کتاب بند کی اور وضو کرکے ان کے ساتھ روانہ ہوگیا۔

قبرستان پہنچا تو وہاں میرے سوا تھوڑے سے آدمی اور کھڑے تھے۔ گنا تو چھوٹے بڑے سترہ آدمی تھے جن میں میت کے گھر کے افراد بھی شامل تھے۔ مجھے ایک مہینہ پہلے کی بات یاد آئی جب کہ سیٹھ فضل علی کے ایک رشتہ دار کا جنازہ اسی قبرستان میں آیا تھا اور قبرستان کے خصوصی حصہ میں دفن ہوا تھا۔ اس دن آدمیوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ شمار کرنا مشکل تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا بستی کی تمام مسلم آبادی نکل آئی ہے۔

میرے پہنچنے کے چند منٹ بعد محلہ کے امام صاحب نماز جنازہ کے لئے کھڑے ہوگئے۔ میں نے بھی صف میں شامل ہوکر نیت باندھ لی مگر امام صاحب نے اتنی تیزی سے نماز پڑھائی کہ میں کوئی دعا بھی پوری نہ پڑھ سکا۔ بس جلدی جلدی چار بار اللہ اکبر کی آواز آئی اور تھوڑی دیر بعد انھوں نے سلام پھیر دیا۔ لوگ اپنے جوتے پہن کر اطمینان کے ساتھ اس طرح کھڑے ہوگئے گویا "نماز جنازہ" کے نام سے جو کام انھیں کرنا تھا اس کو انھوں نے پوری طرح انجام دے دیا ہے۔

قبر قریب ہی تھی۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ابھی کھودی جارہی ہے۔ لوگ دو دو چار چار کرکے اِدھر اُدھر کھڑے ہوگئے۔ کوئی فرقہ وارانہ مظالم کی داستان سنانے لگا۔ کسی نے موسم کی سختی کا ذکر چھیڑ دیا۔ کوئی بازار بھاؤ کے متعلق اپنی معلومات پیش کرنے لگا۔ غرض ادھر اُدھر کی باتیں شروع ہوگئیں۔

میں قبر کے سامنے خاموش کھڑا تھا۔ میرے ذہن میں وہ آیتیں اور حدیثیں گھوم رہی تھیں جن میں قیامت، حشر، جنت، دوزخ وغیرہ کے حالات بتائے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا قبر ایک کھلا ہوا دروازہ ہے جس کے سامنے کھڑے ہوکر میں دوسری دنیا کے مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ میرا دل بے قرار ہوگیا۔ میری زبان سے نکلا "زندگی کا اصل مسئلہ وہ نہیں ہے جس میں لوگ الجھے ہوئے ہیں۔ بلکہ اصل مسئلہ وہ ہے جو موت کے بعد سامنے آنے والا ہے۔ کاش لوگوں کو معلوم ہوتا کہ وہ اس وقت کس واقعہ کے درمیان کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ ایک شخص کی عارضی دنیا سے حقیقی دنیا کی طرف روانگی کی تقریب ہے۔ یہ قبر جو ہمارے سامنے کھودی جارہی ہے، یہ قبر نہیں ہے بلکہ یہ ایک دروازہ ہے جو ایک شخص کو دوسری دنیا میں داخل کرنے کے لئے کھولا گیا ہے۔ جانے والا ابھی اس دروازہ میں داخل ہوکر اُس پار چلا جائے گا۔

جب بھی کوئی شخص مرتا ہے تو یہ ایک خاص وقت ہوتا ہے۔ اس وقت گویا تھوڑی دیر کے لئے اس دنیا کا دروازہ کھولا جاتا ہے جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے۔ اگر دیکھنے والی آنکھ ہو تو اس کھلے ہوئے دروازہ سے دوسری دنیا کی جھلک صاف دیکھی جاسکتی ہے جہاں ہم میں سے ہر شخص کو ایک روز جانا ہے۔ مگر آج کی دنیا کے مناظر نے لوگوں کی نگاہوں کو اس قدر الجھا رکھا ہے کہ عین دروازہ پر کھڑے ہوکر بھی انھیں اس پار کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ وہ حقیقت کے انتہائی قریب پہنچ کر بھی حقیقت سے بے خبر رہ جاتے ہیں۔

خدا سے تعلق

بشیر بدر ایک شاعر تھے۔ بھوپال کی ایک مجلس میں انھوں نے اپنی غزل سنائی۔ اس کا ایک شعر یہ تھا:

گفتگو ان سے روز ہوتی ہے مدتوں سامنا نہیں ہوتا

اس مجلس میں ایک چھوٹا بچہ بھی تھا۔ اس نے یہ شعر سن کر کہا: "بشیر صاحب کیا ٹیلی فون پر گفتگو ہوتی ہے"۔ بشیر بدر نے بچہ کا یہ تبصرہ سنا تو بولے: میاں صاحب زادے، تم نے تو میرے شعر کی کمر توڑ دی۔

بچہ کے گھر پر ٹیلی فون تھا۔ وہ روزانہ دیکھتا تھا کہ اس کے باپ بھائی کسی شخص کی غیر موجودگی میں اس سے ٹیلی فون پر گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ ایک غیر موجود انسان سے ٹیلی فون پر گفتگو اس کے لئے ایک جانی پہچانی چیز تھی۔ مگر وہ ابھی عمر کے اس مرحلہ میں نہیں پہنچا تھا کہ یاد اور تصور کے ذریعہ ہونے والی گفتگو کو جانے۔ ٹیلی فون کے تاروں پر قائم ہونے والے ربط کا اسے تجربہ تھا۔ مگر یاد کے تاروں پر قائم ہونے والا ربط اس کے لئے ابھی تک لامعلوم چیز بنا ہوا تھا۔ اس نے اپنے معلوم تجربہ پر قیاس کرتے ہوئے سمجھ لیا کہ سامنا نہ ہوتے ہوئے اگر گفتگو ہوتی ہے تو یقیناً وہ ٹیلی فون پر ہوتی ہوگی۔

ایسا ہی کچھ معاملہ دین کا بھی ہے۔ دین خدا سے ان دیکھے روحانی تاروں پر مربوط ہونے کا نام ہے۔ دین نام ہے خدا سے ایسے تعلق کا جس میں بندے اور خدا کے درمیان سرگوشیاں جاری ہو جائیں۔ جب بندہ یادوں کی دنیا میں خدا کو پانے لگے۔ جب بندے کا یہ حال ہو جائے گویا کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہے۔ جب بندہ خدا سے مانگے اور اس کو اس سے ملے۔ مگر جو لوگ صرف "ٹیلی فون" کی سطح پر ملاقات کو جانتے ہوں وہ اس غیر ٹیلی فونی ربط کو سمجھ نہیں سکتے۔ اس قسم کی باتیں ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتیں جو خود ان تجربات سے نہ گزرے ہوں۔ جن کی فہم ابھی اس طفلانہ سطح پر ہو جب کہ آدمی صرف ظاہری تاروں پر قائم ہونے والے ربط کو جانتا ہے، وہ باطنی تاروں پر قائم ہونے والے ربط سے آشنا نہیں ہوتا۔

ایسے لوگ اپنے مزاج کے مطابق کسی نہ کسی ظاہری چیز میں اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ خدا سے ربط قائم کرنے کے لئے کسی زندہ یا مردہ بزرگ کا وسیلہ ضروری ہے۔ کچھ لوگ کسی محسوس قبر کو تعلق باللہ کا ذریعہ سمجھ لیتے ہیں۔ کچھ لوگ نوافل اور تسبیحات کی کثرت میں خدا کی قربت کا راز ڈھونڈتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے نزدیک جلسے اور جلوس کی دھوم میں خدا ملتا ہے۔ کچھ لوگ "خدا دشمنوں" کے خلاف اکھیڑ پچھاڑ کی تحریک کو قربت خداوندی کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔

اس قسم کے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ دل گدازی کی سطح پر خدا سے مربوط ہونے کی تڑپ ان کے اندر پیدا نہیں ہوتی۔ وہ بس کسی نہ کسی دکھائی دینے والے "تار" کو پکڑ لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس کے ذریعہ وہ خدا سے ربط قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

بیہقی نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ قریش کے سردار ایک روز مکہ میں جمع ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ اپنے اندر سے ایک ایسے شخص کا انتخاب کرو جو سحر اور کہانت اور شاعری کا بہترین جاننے والا ہو اور اس کو محمدؐ کے پاس بھیجو۔ اس شخص نے ہماری جماعت میں تفریق ڈال دی ہے۔ ہمارے معاملہ کو منتشر کر دیا ہے اور ہمارے دین کو عیب لگایا ہے۔ وہ محمدؐ سے جاکر بات کرے اور دیکھے کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ اس کام کے لئے ہم عتبہ بن ربیعہ سے بہتر کسی شخص کو نہیں جانتے۔

اس کے بعد عتبہ بن ربیعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے کہا اے محمدؐ، تم بہتر ہو یا تمھارے باپ عبداللہ بہتر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چپ رہے، عتبہ نے دوبارہ کہا، تم بہتر ہو یا تمھارے دادا عبدالمطلب بہتر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب بھی چپ رہے۔ عتبہ نے کہا، اگر تمھارا یہ خیال ہو کہ یہ لوگ تم سے بہتر تھے تو انھوں نے انھیں معبودوں کی پرستش کی ہے جن کو تم عیب لگاتے ہو۔ اور اگر تمھارا خیال یہ ہو کہ تم ان سے بہتر ہو تو تم اپنی بات کہو تاکہ ہم سنیں۔ عتبہ جب اپنی بات سے فارغ ہو چکا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کہہ کر سورہ حم سجدہ کی ابتدائی تیرہ آیتیں پڑھیں۔

یہاں تک کہ آپ پڑھتے ہوئے اس آیت پر پہنچے کہ ——— پس اگر وہ اعراض کریں تو ان سے کہہ دو کہ میں تم کو اسی طرح کے صاعقہ (کڑکے) سے ڈراتا ہوں جیسا کڑکا عاد اور ثمود پر نازل ہوا (۱۳) عتبہ نے اس کو سن کر کہا: بس، کیا اس کے سوا کچھ اور تمھارے پاس نہیں۔ آپ نے کہا نہیں۔ عتبہ قریش کے پاس واپس آیا۔ اس کے بعد عتبہ اور قریش کے درمیان گفتگو کی جو روداد نقل ہوئی ہے اس کے چند الفاظ یہ ہیں:

مافهمتُ شيئاً مما قال غير انه انذركم صاعقةً مثل صاعقة عاد وثمود۔ قالوا ويلك يكلمك الرجل بالعربية لا تدري ماقال۔ قال لا والله مافهمت شيئاً مما قال غير ذكر الصاعقة	انھوں نے جو کہا میں اس کو کچھ نہیں سمجھا، سوا اس کے کہ انھوں نے تم کو عاد و ثمود جیسے کڑکے سے ڈرایا۔ قریش نے کہا، تمھارا برا ہو، آدمی تم سے عربی زبان میں کلام کرتا ہے اور تم سمجھے نہیں کہ اس نے کیا کہا۔ عتبہ نے کہا۔ خدا کی قسم میں کڑکے کے ذکر کے سوا اور کچھ نہیں سمجھا۔

قرآن کی اکتالیسویں سورہ کی یہ آیتیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عتبہ بن ربیعہ کو سنائیں ان کو پڑھئے اور پھر غور کیجئے کہ ان آیتوں میں جو بات کہی گئی ہے وہ عتبہ کی سمجھ میں کیوں نہ آسکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قرآنی الفاظ کے عربی مفہوم کو تو وہ جانتا تھا مگر ان کے اندر چھپے ہوئے معانی سے وہ ناآشنا تھا۔

ان آیتوں میں آخرت کی اہمیت کا ذکر ہے جب کہ عتبہ صرف دنیا کی اہمیت سے باخبر تھا۔ ان میں خدا کی بڑائی کا چرچا ہے جب کہ عتبہ صرف انسانوں کی بڑائی سے آشنا تھا۔ ان میں کائنات کو خدائی نشانی کی حیثیت

سے پیش کیا گیا ہے جب کہ عقبہ کائنات کو صرف ایک مادی نشانی کی حیثیت سے جانتا تھا۔ عقبہ کے جینے کی سطح وہ نہ تھی جو قرآن کی سطح ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ قرآن کے ان قیمتی الفاظ میں چھپی ہوئی معنویت کو سمجھنے سے عاجز رہا۔

حقیقت اتنی لطیف چیز ہے کہ وہ لفظوں کی پکڑ میں نہیں آتی۔ الفاظ محدود ہوتے ہیں اور حقیقت غیر محدود۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ حقیقت کو لفظوں میں ڈھالا جا سکے۔ آپ کسی کے کان میں الفاظ داخل کر سکتے ہیں مگر کسی کے کان میں معانی کو داخل نہیں کیا جا سکتا۔ جو آدمی ٹیلی وژن کے بارے میں کچھ نہ جانتا ہو اس کو محض "ٹیلی وژن" کا لفظ بول کر آپ ٹیلی وژن سے باخبر نہیں کر سکتے۔ کوئی بات ہمیشہ لفظوں کے ذریعہ کہی جاتی ہے مگر الفاظ اصل بات کی علامت ہیں نہ کہ اصل بات کا بدل۔ وہ کون سا لفظ ہے جس میں آپ پھول کی خوشبو بھر سکیں۔ وہ کون سا لفظ ہے جس میں آپ سورج کی گرمی داخل کر سکیں۔ وہ کون سا لفظ ہے جو کہکشاں کی وسعتوں کی نمائندگی کر سکے۔

جو شخص پھول اور سورج اور کہکشاں سے واقف ہو اسی کے لئے پھول اور سورج اور کہکشاں کے الفاظ کوئی معنی رکھتے ہیں۔ مگر جو شخص پھول اور سورج اور کہکشاں کے بارے میں کوئی ذاتی واقفیت نہ رکھتا ہو اس کو محض یہ الفاظ بول کر آپ قدرت کے ان حیرت ناک واقعات سے متعارف نہیں کر سکتے جن کو پھول اور سورج اور کہکشاں کہا جاتا ہے۔ آپ پھول کا لفظ بول کر کسی کو اس کی خوشبو نہیں سنگھا سکتے۔ آپ سورج کا لفظ بول کر کسی کو اس کی روشنی اور حرارت کا تجربہ نہیں کرا سکتے۔ آپ کہکشاں کا لفظ بول کر کسی کو کہکشاں کی وسعتوں کا مشاہدہ نہیں کرا سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو جانے اسی کو بتایا جا سکتا ہے۔ جو نہ جانے اس کو کوئی بات بتانا ممکن نہیں۔ جہاں لوگ صرف الفاظ کی زبان سمجھتے ہوں وہاں معانی کی زبان میں کوئی نغمہ کس کے لئے چھیڑا جائے۔ جہاں لوگ صرف ظاہری حقیقتوں کو جانتے ہوں وہاں چھپے ہوئے حقائق سے پردہ کس کے لئے اٹھایا جائے۔ جہاں لوگ صرف اپنی ذات کی سطح پر جیتے ہوں وہاں اپنی ذات سے بلند سطح کی باتوں کا اظہار کس کے لئے کیا جائے۔ جہاں لوگ صرف شور و غل کو کام سمجھتے ہوں وہاں خاموش منصوبہ کا راز کھولا جائے تو کون ہوگا جو اس کو سنے اور کون ہوگا جو اس کو سمجھے۔ جب لوگوں کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہو تو کیسے لوگوں کو بتایا جائے کہ یہاں ایک روشن سورج چمک رہا ہے۔ جب لوگوں نے اپنے کانوں میں ڈاٹ لگا رکھے ہوں تو کیسے ان کو باخبر کیا جائے کہ یہاں ہرے بھرے درخت حمد الٰہی کے نغمے سنا رہے ہیں ——— خدا منتظر ہے کہ کوئی اس کا نغمہ چھیڑے، کوئی اس کی حمد کا ترانہ سنائے۔ مگر انسانوں کے بھرے ہوئے سمندر میں کوئی نہیں جو خدا کا نغمہ گائے، جو آخرت کی بانسری بجائے۔ جو فرشتوں کے چھیڑے ہوئے تاروں سے ہم آواز ہو کر حقیقتِ اعلیٰ کے گیت گائے۔

ہر معاملہ میں احتیاط

غیر مومن ایک بے حس انسان ہوتا ہے اور مومن ایک حساس انسان۔ مومن کی حساسیت صرف خدا یا اس کی مقدس چیزوں ہی میں ظاہر نہیں ہوتی بلکہ خدا کی تمام مخلوقات کے معاملہ میں ظاہر ہوتی ہے۔

مومن کا سابقہ جب کسی انسان سے پیش آتا ہے، خواہ وہ کمزور ہو یا طاقت ور، تو وہ ایک محتاط قلب کے ساتھ اس کے وہ تمام حقوق ادا کرتا ہے جو خدا نے ایک انسان کے لئے دوسرے انسان کے اوپر مقرر کئے ہیں۔ وہ جب کسی جانور کو اپنے استعمال میں لاتا ہے تو اس وقت بھی وہ مہربانی کے تمام آداب کا لحاظ رکھتا ہے، حتیٰ کہ موذی جانوروں کو مارنا پڑے تو اس وقت بھی وہ ان کو بے رحمی کے ساتھ تکلیف دے دے کر مارنا اپنے لئے جائز نہیں سمجھتا۔ اس کی حساسیت اس میں بھی رکاوٹ بن جاتی ہے کہ وہ کسی درخت کو خواہ مخواہ کاٹے اور کسی پھول کو بے ضرورت مسلے۔ پانی سے کام لیتے ہوئے بھی وہ اس کا خیال رکھتا ہے کہ بے فائدہ پانی نہ بہائے اور غیر ضروری طور پر خدا کی نعمت کو خرچ نہ کرے۔

ایمان آدمی کے اندر جو احتیاط اور حساسیت پیدا کرتا ہے وہ اس کا عمومی مزاج بن جاتی ہے اور اس کی تمام کارروائیوں میں ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ اس کا بولنا، اس کا چلنا پھرنا، اس کا معاملہ کرنا، حتیٰ کہ بے جان اور بے زبان چیزوں کو کام میں لانا، سب کچھ اس کے اس عام مزاج کے ماتحت ہو جاتے ہیں۔ جذباتی مواقع پر بھی وہ احتیاط کے پہلو کو نہیں بھولتا، قابو یافتہ ہونے کے باوجود کسی کو اس سے بے رحمی اور بے حسی کا تجربہ نہیں ہوتا۔

مومن آدمی وہ ہے جس کو یہ کھٹکا لگا ہوا ہو کہ اس کا خدا اس کو دیکھ رہا ہے اور وہ اس سے اس کے تمام کھلے اور چھپے کا حساب لے گا۔ ایسا آدمی عین اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک محتاط آدمی بن جاتا ہے۔

جانوروں سے پیچھے

جنگلی ہرنوں کو اگر آپ جنگل میں دیکھیں تو وہ ہمیشہ غول کی صورت میں دکھائی دیں گے۔ ہرن، دوسرے اکثر جانوروں کی طرح، کبھی اکیلا نہیں رہتا۔ وہ ہمیشہ اپنی جماعت کے ساتھ رہتا ہے۔ ہرن کی زندگی کا مقصد اگرچہ غذا اور پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ مگر جنگل کی دنیا میں ہر وقت چھوٹے جانوروں کو بڑے جانوروں کا ڈر لگا رہتا ہے۔ ہر جانور کو یہ خطرہ رہتا ہے کہ اس سے بڑا جانور اس کو اپنا شکار نہ بنالے۔ اس لئے جنگل کے جانور الگ الگ نہیں رہتے۔ بلکہ غول کی صورت میں زندگی گزارتے ہیں۔ وہ ساتھ چلتے ہیں۔ ساتھ بیٹھتے ہیں۔ ساتھ مل کر اپنے سب کام کرتے ہیں۔ ایسا وہ اس لئے کرتے ہیں کہ کوئی خطرہ پیش آئے تو سب مل کر اس کا مقابلہ کرسکیں۔ وہ نازک موقع پر دشمن کے مقابلہ میں اکیلے نہ رہیں۔ وحشی جانور اپنی ساری وحشت کے باوجود اپنے تحفظ کی خاطر اکھٹا ہو جاتے ہیں۔

جنگل کا ایک جانور جانتا ہے کہ تنہا رہنا گویا اپنے آپ کو اس کے لئے چھوڑ دینا ہے کہ دشمن جب بھی چاہے اس کو اپنا شکار بنالے۔ اس کے برعکس نظم اور اتحاد دشمن کے خلاف مضبوط دیوار ہیں۔ قدرت نے ہر جانور کو یہ سبق فطری طور پر سکھا دیا ہے۔ وہ اس سبق کو پوری طرح اپنے حق میں استعمال کرتا ہے۔ وہ جنگل کی غیر محفوظ دنیا میں پوری حقیقت پسندی کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔

انسان بھی اس حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے۔ جس بات کو جانور صرف جبلّی طور پر جانتے ہیں وہ انسان کو عقلی اور شعوری طور پر معلوم ہے۔ مگر بہت کم مثالیں ملیں گی جب کہ انسان نے اس واقفیت کو عملی طور پر پوری طرح استعمال کیا ہو۔ وہ اکثر اس معاملہ میں ناکام ثابت ہوتا ہے۔ انسان، انسان ہونے کے باوجود جنگل کے وحشی جانوروں سے پیچھے ہے۔

انسان کیوں متحد نہیں رہ پاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اتحاد ہر شخص سے ایک قربانی مانگتا ہے۔ یہ قربانی کہ فرد اپنی انفرادیت کو اجتماع کے حوالے کردے۔ آدمی اپنی ذات کو اہمیت دینے کے بجائے پورے مجموعہ کو اہمیت دینے لگے۔ یہ انا کی قربانی ہے اور انا کی قربانی کسی آدمی کے لئے سب سے مشکل قربانی ہے۔ آدمی جان کو قربان کرسکتا ہے مگر وہ اپنی انا کو دوسرے کے حوالے کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ انسان کی یہی کمزوری ہے جو ہمیشہ اتحاد و اجتماعیت کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔ جانور اس معنی میں اپنی کوئی انا نہیں رکھتے۔ کوئی چیز ان کے لئے عزت کا سوال نہیں بنتی، یہی وجہ ہے کہ وہ نہایت آسانی کے ساتھ متحد ہو جاتے ہیں۔ اتحاد کا راز بے انا ہونا ہے۔ جہاں اتحاد نہ ہو سمجھ لیجئے کہ وہاں بے انا انسانوں کا وجود نہیں۔

سب کچھ خدا کی طرف سے

۱۶ھ میں مسلمان فوجیں ابوعبیدہؓ کی قیادت میں شام کو فتح کرتے ہوئے فلسطین تک پہنچ گئیں۔ عیسائی بیت المقدس میں قلعہ بند ہو گئے اور مسلم فوجوں نے اس کو اپنے محاصرہ میں لے لیا۔ اس وقت عیسائیوں کی طرف سے صلح کی پیش کش ہوئی جس میں ایک خاص شرط یہ تھی کہ خلیفہ (عمر فاروقؓ) خود آکر عہدنامہ کی تکمیل کریں۔ حضرت ابوعبیدہ نے عیسائیوں کی اس پیش کش سے خلیفہ دوم کو مطلع کیا۔ آپ نے اصحاب سے مشورہ کیا اور بالآخر مدینہ سے نکل کر فلسطین کے لئے روانہ ہوئے۔

حضرت عمر فاروق کے ساتھ ایک اونٹ تھا اور ایک خادم۔ جب آپ مدینہ کے باہر پہنچے تو آپ نے خادم سے کہا۔ ہم دو ہیں اور سواری ایک ہے۔ اگر میں سواری پر بیٹھوں اور تم پیدل چلو تو میں تمھارے اوپر ظلم کروں گا۔ اور اگر تم سواری پر بیٹھو اور میں پیدل چلوں تو تم میرے اوپر ظلم کرو گے۔ اگر ہم دونوں اکھٹے سوار ہو جائیں تو ہم جانور کی پیٹھ توڑ ڈالیں گے۔ اس لئے ہم کو چاہئے کہ ہم راستہ کی تین باریاں مقرر کرلیں۔ چنانچہ سارا سفر اس طرح طے ہوا کہ ایک بار عمر فاروق بیٹھتے اور خادم اونٹ کی نکیل پکڑ کر چلتا۔ پھر خادم بیٹھتا اور عمر فاروقؓ اونٹ کی نکیل پکڑ کر چلتے۔ اس کے بعد کچھ دور تک اونٹ خالی چلتا اور دونوں اس کے ساتھ پیدل چل رہے ہوتے۔ اس طرح سارا سفر طے ہوتا رہا۔

حاکم نے روایت کیا ہے کہ اس سفر کے دوران یہ واقعہ پیش آیا کہ جب آپ اسلامی لشکر سے ملے تو ان لوگوں نے دیکھا کہ آپ ایک تہ بند باندھے ہوئے ہیں اور کسی قسم کا کوئی سامان آپ کے پاس نہیں ہے۔ حضرت ابوعبیدہ (فوج کے افسر اعلیٰ) نے کہا کہ اے امیر المومنین آپ کو عیسائیوں کے فوجی افسروں اور ان کے مذہبی عہدیداروں سے ملنا ہے اور آپ اس حال میں ہیں۔ عمر فاروق نے کہا: اے ابوعبیدہ، کاش یہ بات تمھارے سوا کوئی اور کہتا۔ ہم دنیا میں سب سے پست قوم تھے پھر اللہ نے اسلام کے ذریعہ ہم کو عزت دی۔ جب بھی ہم اس کے سوا کسی اور چیز کے ذریعہ عزت چاہیں گے تو اللہ ہم کو ذلیل کر دے گا (انا کنا اذل قوم فاعزنا اللہ بالاسلام فمهما نطلب العز بغیر ما اعزنا اللہ به اذلنا اللہ)

عزت اور ذلت کو اللہ کی طرف سے سمجھنا ایک ایسا عقیدہ ہے جو آدمی کو بغیر کسی ہتھیار کے ہتھیار والا بنا دیتا ہے۔ یہ عقیدہ آدمی کو ایک ایسی خود اعتمادی سکھاتا ہے جو کسی خارجی سہارے کے بغیر اپنی اندرونی طاقت کے اوپر قائم ہوتی ہے اس کا خزانہ آدمی کے اندر ہوتا ہے نہ کہ اس کے باہر اور جس طاقت کی بنیاد اندرونی جذبہ پر ہو اس کو کوئی چھیننے والا کبھی چھین نہیں سکتا۔

وعظ کون کرے

ایک بزرگ نے فرمایا: وعظ وہ شخص کرے جس کو وعظ کا کم سے کم اتنا تقاضا ہو جتنا ایک شخص کو رفع حاجت کا ہوتا ہے۔ وعظ کا مطلب ریکارڈ بجانا نہیں ہے اور نہ یہ مقصد ہے کہ ایک شاندار تقریر کرکے لوگوں سے یہ داد لی جائے کہ خوب بولے۔ وعظ کا مطلب اپنے اندرون کو انڈیلنا ہے، ایک پائی ہوئی حقیقت کو دوسروں تک پہنچانا ہے۔ ایک چھپی ہوئی بات کو لوگوں پر کھولنے کے لئے زندہ گواہ بن کر کھڑا ہونا ہے۔ اس قسم کا وعظ محض کچھ الفاظ بولنا نہیں بلکہ ایک مشکل ترین عمل کرنا ہے۔ کوئی شخص حقیقی معنوں میں یہ عمل اسی وقت کرسکتا ہے جب کہ وہ اپنی بات کو کہنے کے لئے اتنا مضطرب ہوچکا ہو کہ وہ محسوس کرے کہ اس کو ہر قیمت پر اپنی بات لوگوں تک پہنچانی ہے، خواہ اس کے لئے لوگ اس سے ناراض ہوجائیں اور خواہ اس کی راہ میں اس کو اپنا سب کچھ کھو دینا پڑے۔

یہی معاملہ تحریر کا بھی ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ اتنا زیادہ مطالعہ کرے کہ معلومات اس کے ذہن سے ابلنے لگیں۔ متعلقہ موضوع پر جو ذخیرہ تیار ہوچکا ہے اس کو چھاننے کے بعد وہ محسوس کرے کہ اب بھی کچھ لکھنے کے لئے باقی ہے۔ اس کا حال یہ ہوجائے کہ اس کی معلومات تھامے نہ تھمیں اور اس کی بے تابی روکے نہ رکے۔ جب یہ نوبت آجائے اس وقت آدمی کو لکھنے کے لئے اٹھنا چاہئے۔ اس کے بغیر جو لوگ لکھیں وہ صرف سفید کاغذ کو سیاہ کرنے کا کام کریں گے اور اس کے بغیر جو لوگ بولیں وہ صرف فضائی شور وغل میں اضافہ کا باعث ہونگے اس طرح کا لکھنا اور بولنا نہ سننے والوں کو کوئی فائدہ دیتا ہے اور نہ سنانے والوں کو۔

واعظ کا وعظ کوئی کھیل تماشا نہیں، وہ بندوں کے سامنے خدا کی نمائندگی ہے۔ اس کام کو کرنے کا حق صرف اس شخص کو ہے جو اپنی ہستی کو خدا میں گم کردے۔ جو لوگ اس کے بغیر واعظ بنیں وہ حقیقۃً مجرم ہیں نہ کہ واعظ۔

البرٹ آئن سٹائن (۱۹۵۵ — ۱۸۷۹) نے زمان ومکان کے بارے میں جو نظریہ پیش کیا تھا۔ اس نے اس کو غیر معمولی شہرت دی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آئن سٹائن کی سائنسی قیمت حقیقتاً اس سے کم تھی جتنی اس کو شہرت حاصل ہوئی۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی ایک توجیہہ یہ کی گئی ہے کہ آئن سٹائن کی تحقیقات کا تعلق کائنات کی ابدی حقیقتوں سے تھا اور جو آدمی کائنات کی ابدی حقیقتوں میں جھانکنے کی کوشش کرتا ہے وہ لوگوں کی نظر میں خصوصی اہمیت حاصل کر لیتا ہے۔ ایک مبصر نے لکھا ہے:

Whoever finds that which enables us to obtain a deeper glimpse into the eternal secrets of nature has been given great grace. That was the grace of Albert Einstein's unique greatness — to try to find such thoughts.

The Hindustan Times, March 15, 1981

جو شخص کوئی ایسی دریافت کرتا ہے جو ہم کو اس قابل بنائے کہ ہم فطرت کے رازوں کی کوئی گہری جھلک دیکھ سکیں اس کو بہت زیادہ عزت دی جاتی ہے۔ البرٹ آئن سٹائن کو جو خصوصی عزت ملی وہ اسی لئے تھی کہ اس نے اس قسم کے افکار تک پہنچنے کی کوشش کی۔

کائنات کی ابدی حقیقتوں کو جاننے کی خواہش انسان کی فطرت میں اس طرح سمائی ہوئی ہے کہ وہ کسی طرح اپنے کو اس سے الگ نہیں کر سکتا۔ قدیم ترین زمانہ سے انسان فطرت کے ابدی رازوں کی کھوج میں رہا ہے۔ مگر ابھی تک وہ ان کو پا نہ سکا۔ انسان اگر اپنی ذاتی کوششوں سے اس حقیقت تک نہیں پہنچا تو وہ اس کے لئے معذور تھا۔ اس کی محدودیت اس کی راہ میں فیصلہ کن طور پر حائل تھی۔ تاہم سوال یہ ہے کہ قدیم ترین زمانہ سے پیغمبر اس راز سے پردہ ہٹاتے رہے ہیں۔ پھر تلاش کے باوجود انسان نے کیوں پیغمبروں کے جواب کو نہیں مانا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر کا جواب اپنے ساتھ جزا وسزا اور جنت وجہنم کا تصور لاتا ہے۔ وہ انسان سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنی آزاد زندگی کو ختم کر دے اور زمین پر ایک قسم کی پابند زندگی گزارے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اپنی تلاش کے پیغمبرانہ جواب کو ماننے پر تیار نہیں ہوتا۔ وہ برابر اس کوشش میں رہتا ہے کہ وہ فطرت کے رازوں کا کوئی ایسا حل دریافت کرے جو اس کی تلاش کا جواب تو ہو مگر وہ اس کی زندگی پر کوئی پابندی نہ لگائے، وہ اس کو مستقبل کے اندیشوں میں مبتلا کرنے والا نہ ہو۔ بے شمار لوگ نام نہاد روحانی شخصیتوں کے جواب کو مان لیتے ہیں مگر وہ پیغمبروں کے جواب کو ماننے پر راضی نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ روحانی شخصیتوں کے جواب میں صرف روحانی آنند ہے، اس میں روحانی کھٹک کا کوئی خانہ نہیں۔ جب کہ پیغمبروں کا جواب آدمی سے اس کی آزادی چھین لیتا ہے، وہ زندگی بھر کے لئے آدمی کو آخرت کے اندیشے میں مبتلا کر دیتا ہے۔

کامیابی کا راز حقیقت سے مطابقت میں ہے نہ کہ حقیقت سے فرار میں۔ اگر اصل حقیقت وہی ہو جس کی طرف پیغمبروں نے رہنمائی کی ہے تو اس کے سوا کسی اور حقیقت کی تلاش میں لگنا اپنے وقت کو ضائع کرنا ہے۔ جو چیز فی الواقع موجود نہ ہو اس کو کوئی شخص کہاں سے برآمد کر سکتا ہے۔

دلیل کو نہ ماننا خدا کو نہ ماننا ہے

قرآن کی دوسری سورہ میں ارشاد ہوا ہے کہ پتھروں میں بعض ایسے پتھر ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں (وانّ منها لما يهبط من خشية الله، بقرہ ۷۴) اس آیت میں ہبوط سے مراد پہاڑ کے اوپر سے پتھر کا لڑھک کر گرنا (Landslide) ہے۔ پہاڑوں کے اوپر سے پتھروں کا گرنا دراصل ایک تمثیل ہے کہ انسان کو کس طرح خدا کے آگے گر پڑنا چاہئے۔ پتھر کا ہبوط انسان کے ہبوط کو ممثل کرتا ہے۔ اس صورت حال کی ایک مثال حضرت عمر فاروق کا واقعہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو صحابہ شدید طور پر متاثر ہوئے۔ حضرت عمر کے لئے یہ یقین کرنا مشکل ہوگیا کہ آپ کی وفات ہوگئی ہے۔ وہ مسجد نبوی میں تلوار لے کر کھڑے ہوگئے اور کہنا شروع کیا کہ کچھ منافقین یہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے۔ خدا کی قسم رسول اللہ کی وفات نہیں ہوئی ہے۔ وہ اپنے رب کے پاس گئے ہیں جیسے حضرت موسیٰ اپنے رب کے پاس گئے تھے۔ وہ اپنی قوم سے چالیس دن تک غائب رہے یہاں تک کہ لوگ کہنے لگے کہ موسیٰ کی وفات ہوگئی۔ خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح واپس آئیں گے جس طرح حضرت موسیٰ واپس آئے۔ پھر آپ ان لوگوں کے ہاتھ اور پاؤں کاٹیں گے جو یہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی ہے۔

اس کے بعد حضرت ابوبکر آئے اور کہا کہ اے عمر چپ رہو۔ مگر وہ چپ ہونے پر راضی نہ ہوئے۔ جب حضرت ابوبکر نے دیکھا کہ حضرت عمر چپ نہیں ہو رہے ہیں تو لوگوں کے سامنے کھڑے ہوکر تقریر شروع کردی۔ اس تقریر میں حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ اے لوگو سنو، جو شخص محمد کی پوجا کرتا تھا تو محمد کا انتقال ہوگیا۔ اور جو شخص اللہ کو پوجتا تھا تو اللہ زندہ ہے، اس پر کبھی موت نہیں آئے گی۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر نے بلند آواز سے قرآن کی یہ آیت پڑھی: محمد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ مرجائیں یا قتل کردئے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤگے۔ اور جو کوئی الٹے پاؤں پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ اور اللہ شکر کرنے والوں کو ثواب دے گا (آل عمران ۱۴۴)

اس آیت کو سننے کے بعد حضرت عمر فاروق کا جو حال ہوا وہ ان کے اپنے الفاظ میں یہ تھا:

فواللہ ما هو الّا ان سمعتُ ابابكر تلاها	خدا کی قسم جب ابوبکر نے یہ آیت پڑھی تو اس کو سن کر میں
فعقِرتُ حتى وقعتُ الى الارض ما تحملني	دہشت زدہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ میں زمین پر گر پڑا،
رجلاىَ وعرفتُ انّ رسول الله صلى الله عليه وسلم	میرے دونوں پاؤں میرا بوجھ نہ اٹھا سکے اور میں نے

قدمات (سیرۃ ابن ہشام جلد۴ صفحہ ۳۳۵)　　جان لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے

خدا کی دلیل آتے ہی عمر فاروق کا گر پڑنا عین ویسا ہی تھا جیسے پتھر بلندی سے گر پڑتا ہے۔ پتھر کا ہبوط خشیت کی تمثیل ہے اور عمر فاروق کا ہبوط خشیت کی تعمیل۔ اللہ کو یہ مطلوب ہے کہ جب اس کی کوئی بات سامنے آجائے تو آدمی ڈھٹائی نہ کرے بلکہ وہ خدا کے خوف سے اس کے آگے گر پڑے، وہ گر پڑنے کی حد تک اس کو مان لے۔ اس گر پڑنے کو خدا نے ہبوط حجری کی صورت میں ممثل کر دیا۔ اس نے پتھر کی صورت میں انسان کو دکھا دیا کہ جب کوئی خدائی معاملہ سامنے آجائے تو کس طرح اختیار کے باوجود وہ بے اختیار مخلوق کی طرح خدا کے آگے ڈھ پڑے۔ عمر فاروقؓ کے سامنے جب اس قسم کا لمحہ آیا تو وہ اللہ کے حکم کے آگے بالکل بے اختیار ہو کر گر پڑے۔ ہبوط حجری اور ہبوط عمری دونوں ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ ایک جگہ یہ حقیقت بے اختیاری کے ساتھ ظاہر ہو رہی ہے اور دوسری جگہ اختیار اور آزادی کے ساتھ۔ عمر فاروق کا یہ عمل اتنا کامل تھا کہ وہ خدا کی مقرر کردہ تمثیلی میزان سے ناپنے میں عین اس کے مطابق اترتا ہے۔

حضرت عمر کے سامنے اس وقت جو چیز آئی وہ بس قرآن کی ایک آیت تھی۔ یعنی بولے ہوئے چند الفاظ۔ وہ اس مجموعۂ الفاظ کو ماننے سے انکار کر سکتے تھے۔ اگر وہ اپنی بڑائی کو باقی رکھنے کی خاطر اسے ٹھکرا دیتے تو قدیم عرب میں بہت سے لوگ آپ کا ساتھ دینے والے مل جاتے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے قول کی خوبصورت تاویل بھی کر سکتے تھے۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ میں وفات رسول کا منکر نہ تھا۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ خلافت کا مسئلہ حل ہو جانے تک آپ کی وفات کو راز میں رکھا جائے۔ خلافت کا مسئلہ حل ہو جانے کے بعد اس کا اعلان کیا جائے۔ مگر انھوں نے نہ تو اس کا انکار کیا اور نہ تاویل کے ذریعہ اپنی ساکھ کو بحال رکھنے کی کوشش کی۔ اس کے بجائے وہ دلیل کی صورت میں ظاہر ہونے والے خدا کے آگے اس طرح گر پڑے جیسے کہ خدا خود عیاناً ان کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا ہو۔

دنیا میں ہمیشہ دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو خدا کی عظمتوں میں جی رہے ہوں۔ دوسرے وہ جو کسی غیر خدائی عظمت میں سانس لیتے ہوں، خواہ یہ غیر خدا ان کی اپنی ذات ہو یا کوئی اور۔ پہلی چیز کا نام توحید اور دوسری چیز کا نام شرک ہے۔ جنت صرف ان خوش قسمت افراد کے لئے ہے جو خدا کی بڑائی میں جیتے ہوں، جن کی روح نے خدا کی عظمت میں اپنی غذا پائی ہو۔ اس کے برعکس جو لوگ دوسری دوسری عظمتوں کو اپنی روح کی خوراک بنائے ہوئے ہوں وہی وہ لوگ ہیں جو جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ جنت خدا کا پڑوس ہے اور خدا کا پڑوس انھیں لوگوں کو مل سکتا ہے جو خدا میں جئے ہوں۔ جو لوگ دوسری دوسری چیزوں میں جئیں وہ خدا کے پڑوس میں کیونکر بسائے جا سکتے ہیں۔

خدا کے جتنے نبی آئے وہ سب عام انسانوں کی طرح ایک انسان تھے۔ ان کے پاس جو مزید چیز تھی

وہ صرف بینہ (دلیل) تھی۔ اسی دلیل کے ماننے یا نہ ماننے پر قوموں کے لئے انعام یا سزا کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دلیل دنیا کی زندگی میں خدا کا نمائندہ ہے۔ خدا کا پانے والا وہ ہے جو دلیل کے روپ میں خدا کو پالے۔ جو شخص دلیل کے روپ میں ظاہر ہونے والے خدا کو نہ پائے وہ خدا کے نزدیک اندھا ہے۔ اس کے لئے خدا کی رحمتوں کی دنیا میں کوئی حصہ نہیں۔

خدا کو دلیل کے روپ میں پانا کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ حق کی وضاحت جب دلیل کی زبان میں ہو جائے تو اس کے وزن کو محسوس کرنے میں آدمی کے لئے کوئی چیز رکاوٹ نہ بنے۔ دلیل کا فیصلہ خواہ اپنی رائے کی موافقت میں جارہا ہو یا اس کے برعکس ہو۔ دلیل سے ثابت ہونے والی بات اپنی مصلحتوں کے مطابق ہو یا اس کے خلاف ہو۔ دلیل سے جو بات نکل رہی ہو اس میں اپنے فائدے باقی رہتے ہوں یا مجروح ہوتے ہوں، ہر حال میں آدمی دلیل کے وزن کو پوری طرح محسوس کرلے۔ کوئی بھی نفسیاتی پیچیدگی یا ذہنی مفاد اس کے اوپر ایسا غالب نہ آئے کہ وہ دلیل کو دلیل کی صورت میں نہ دیکھ سکے۔ جب بھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی دلیل کے وزن کو محسوس نہیں کر پاتا تو اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ خدا کے سوا کہیں اور اٹکا ہوا ہوتا ہے۔ اگر وہ ہر قسم کی غیر خدائی عظمتوں سے بلند ہو تو دلیل کے وزن کو پانا اس کے لئے کبھی مشکل نہ ہوگا۔

موجودہ دنیا میں خدا دلیل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور آخرت میں خدا خود اپنی ذات کمال کے ساتھ عیاناً لوگوں کے سامنے ظاہر ہو جائے گا۔ قیامت میں ہر آدمی خدا کو ماننے پر مجبور ہوگا۔ مگر مومن اور موحد وہ ہے جو دلیل کی صورت میں ظاہر ہونے والے خدا کے سامنے آج اسی طرح ڈھ پڑے جس طرح غیر مومن اور غیر موحد کل قیامت کے دن خدا کے سامنے ڈھ پڑے گا جب کہ وہ فرشتوں کے جلو میں عیاناً انسان کے سامنے ظاہر ہو جائے گا۔

خدا کی بات کے سامنے جھک جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی خدا کے معاملہ میں پوری طرح سنجیدہ ہے۔ ایک بچہ انگارہ کو ہاتھ میں اٹھا سکتا ہے۔ مگر ایک باہوش آدمی کبھی آگ کے انگارہ کو ہاتھ میں نہ لے گا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ انگارہ کے مقابلہ میں اس کا ہاتھ کمزور ہے۔ اس کا یہ یقین اس کو انگارہ کے بارے میں آخری حد تک سنجیدہ بنا دیتا ہے۔ انگارہ کے معاملہ کو وہ کبھی غیر سنجیدہ انداز میں نہیں لیتا۔ اسی طرح جس شخص کو خدا کی معرفت حاصل ہو۔ جو خدا کے عظمت و کمال کو پا گیا ہو وہ خدا کا معاملہ آتے ہی فوراً سنجیدہ ہو جائے گا۔ خدا کی طاقت انگارہ کی طاقت سے بے حساب گنا زیادہ ہے۔ پھر انگارہ کا علم جب آدمی کو پوری طرح سنجیدہ بنا دیتا ہے تو خدا کا علم اس کو کیوں سنجیدہ نہیں بنائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کی بات آجانے کے باوجود جو شخص سنجیدہ نہ ہو وہ صرف اس کا ثبوت دے رہا ہے کہ خدا کے زبانی اقرار کے باوجود اس کو خدا پر یقین نہیں۔

نظر انداز کرو

"میں تمھاری صورت دیکھنا نہیں چاہتا"، کہنے والے نے کہا
"اپنی آنکھیں بند کرلو، میری صورت تمھیں دکھائی نہیں دے گی"
"میں تمھاری آواز سننا نہیں چاہتا" کہنے والے نے دوبارہ کہا
"اپنے کان بند کرلو، میری آواز تمھیں سنائی نہیں دے گی"

رامائن کے دو کرداروں کا یہ سادہ مکالمہ زندگی کی بہت بڑی حقیقت بیان کر رہا ہے۔ یہ حقیقت کہ جس مسئلہ سے نجات حاصل کرنے کے لئے آدمی دوسروں کے پیچھے دوڑتا ہے، اس کو وہ اپنے آپ پر عمل کرکے زیادہ بہتر طور پر حل کرسکتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب آدمی کو کسی دوسرے شخص سے کوئی شکایت پیدا ہوتی ہے تو وہ فوراً اس شخص کے خلاف کارروائی شروع کر دیتا ہے اور پھر جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ کہ نہ صرف پہلا مسئلہ بدستور باقی رہتا ہے بلکہ بے شمار نئے نئے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہر مسئلہ کا زیادہ آسان اور یقینی حل یہ ہے کہ آدمی اپنے ذہن کو اس سے ہٹالے، اس سے الجھ کر اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنے آپ کو زیادہ مفید کاموں میں مصروف رکھے۔

کسی مفکر نے بالکل صحیح کہا ہے کہ "دوسروں کے پیچھے پڑنے کے بجائے اپنے پیچھے پڑو، کیونکہ اپنے آپ کو پکڑ کر تم زیادہ بہتر طور پر دوسرے کو پکڑ سکتے ہو"۔ اکثر لوگ زندگی کے اس راز کو نہیں جانتے۔ وہ اپنی طاقت اور اپنے وقت کا بڑا حصہ اپنے مفروضہ مخالفین کو سبق سکھانے میں ضائع کر دیتے ہیں۔ اگر وہ اس طاقت اور وقت کو اپنی تعمیر میں لگائیں تو اپنے کو مضبوط اور کامیاب بنا کر وہ زیادہ کامیابی کے ساتھ اپنے مخالفین کو سبق دے سکتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دوسرے شخص کی برائی کو نظر انداز کرنا ہمیشہ اس سے مقابلہ کرنے کا زیادہ کامیاب طریقہ ہوتا ہے۔ آپ کی بڑھی ہوئی طاقت آپ کے مخالف کو مرعوب کرکے بٹھا دیتی ہے۔ وہ آپ کے خلاف مزید کارروائی کرنے کا حوصلہ کھو دیتا ہے۔ اس کے برعکس جب آپ برائی کرنے والے سے اپنے کو الجھا دیں تو یہ ہمیشہ تھوڑے نقصان کو بچانے کی خاطر بڑے نقصان کو برداشت کرنے کی قیمت پر ہوتا ہے۔ اس طرح آپ اپنے وقت اور قوت کو بھی ضائع کرتے ہیں اور دوسرے کو موقع دیتے ہیں کہ وہ اپنے اندر چھپی ہوئی مزید برائیوں کے ساتھ آپ کے اوپر پل پڑے۔

سماج کی ملی جلی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ہم کو کسی کی بات سے تکلیف پہنچتی ہے۔ کسی کا کوئی کام ہمارے لئے پریشانی کا باعث بن جاتا ہے۔ ایسے مواقع پر تکلیف ہونا فطری ہے۔ مگر ایسے مواقع پر سہارے سے کام لینے ہی میں ہر قسم کی ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔ اگر ہم برداشت نہ کریں اور بپھر کر دوسرے سے لڑنے لگیں تو اس سے مسئلہ حل نہیں ہوتا بلکہ اور بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ ہمارے بپھرنے سے دوسرا شخص بھی بپھرتا ہے اور بات بڑھتی چلی جاتی ہے۔ دوسرے کو برباد کرنے کی کوشش میں ہم خود اپنے آپ کو برباد کر لیتے ہیں۔

ایک شخص ایک مکان کی اوپر کی منزل پر رہتا تھا۔ نیچے خالی جگہ تھی جہاں لڑکے کبھی کبھی آکر کھیلتے اور شور

مچاتے۔ اوپر والے کو لڑکوں کا شور پسند نہ تھا۔ اس نے منع کیا مگر لڑکے نہ مانے۔ آخر ایک دن غصہ میں آکر اس نے یہ کیا کہ لڑکوں کے اوپر چھت سے گندا پانی گرا دیا۔ لڑکے اس میں بھیگ گئے۔ اب لڑکوں کے غصہ کی باری تھی۔ انھوں نے آپے سے باہر ہو کر چھت کی طرف اینٹ کے ٹکڑے پھینکنے شروع کئے جو نیچے پڑے ہوئے تھے۔ ایک ٹکڑا آکر واش بیسن پر گرا جو اوپر والے کے مکان میں باہر کی جانب لگا ہوا تھا۔ چینی کا واش بیسن فوراً ٹوٹ گیا۔ لڑکے تو چند منٹ کے بعد بھاگ گئے۔ مگر اس کا ٹوٹا ہوا قیمتی واش بیسن اس واقعہ کی افسوسناک یادگار بن کر باقی رہ گیا۔ آدمی نے اگر لڑکوں کے شور کی طرف سے اپنے "کان" بند کر لئے ہوتے تو وہ شور سے بھی بچ جاتا اور واش بیسن کے نقصان سے بھی۔

کھونا بھی پانا ہے

"حادثات آدمی کو ہیرو بنا دیتے ہیں" کسی مفکر کا یہ قول لوئی بریل (۱۸۵۲ — ۱۸۰۹) کی زندگی پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ لوئی بریل ایک بڑھئی کا لڑکا تھا۔ ابھی وہ تین سال کا تھا کہ باپ کی دکان میں ایک حادثہ ہونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں جاتی رہیں۔ وہ ہمیشہ کے لئے اندھا ہو گیا۔ یہی فرانسیسی اندھا ہے جس نے تاریخ میں پہلی بار اندھوں کے لئے پڑھنے لکھنے کا وہ علامتی طریقہ ایجاد کیا جس کو اسی کے نام پر بریل کا طریقہ (Braille System) کہا جاتا ہے۔ لوئی بریل کے لئے بظاہر دنیا تاریک ہو چکی تھی۔ مگر اس کے شوق اور محنت نے تاریکی میں بھی ایک نئی روشنی کا راز دریافت کر لیا۔

اسی قسم کا واقعہ ہیلن کیلر (۱۹۶۸ — ۱۸۸۹) کا ہے۔ یہ امریکی خاتون ابھی صرف ڈیڑھ سال کی تھی کہ ایک مہلک بخار میں وہ اندھی اور بہری ہو گئی۔ چونکہ وہ نہ دیکھ سکتی اور نہ سن سکتی تھی اس لئے وہ بولنا بھی نہ سیکھ سکی۔ آنکھ اور کان دونوں سے محرومی نے اس کو بالکل بے بسی کی حالت میں ڈال دیا تھا۔ بظاہر اب ہیلن کیلر کے لئے ایک ہی انجام مقدر تھا۔ وہ کسی معذور خانہ میں کس مپرسی کی زندگی گزارتے ہوئے مر جائے۔ ہیلن کیلر نے آنکھ اور کان کھو دئے تھے مگر اس نے ہمت نہیں کھوئی تھی۔ اس نے طے کیا کہ وہ آنکھ نہ ہوتے ہوئے دیکھے گی اور کان نہ ہوتے ہوئے سنے گی۔ وہ ان خوش قسمت لوگوں کی مانند بنے گی جن کو قدرت کی طرف سے آنکھ اور کان حاصل ہوتے ہیں۔

جب آدمی عزم کر لے تو راہیں بھی کھلنے لگتی ہیں۔ ہیلن کیلر کو اپنی مدد کے لئے ایک لائق ٹیچر مس سولیون مل گئی۔ ہیلن کیلر نے انگلی سے چھو کر پڑھنے والے حروف سیکھے۔ یہاں تک کہ اس کو پڑھنا آ گیا۔ بہری ہونے کے باوجود اس نے اپنی محنت سے بولنا سیکھ لیا۔ اس نے یہ کیا کہ اس کی استانی جب بولتی تو وہ اس کے حلق پر اور اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر حلق اور ہونٹ پر الفاظ کی حرکاتی شکل کو محسوس کرتی اور ان حرکتوں کو انگلی سے سمجھ کر اپنی زبان سے ان کی نقل کرتی۔ اس انوکھے قسم کی تعلیمی کوشش میں برسہابرس لگ گئے۔ مگر بالآخر اس کی کوشش کامیاب ہوئی۔ اس نے انگلیوں کی مدد سے الفاظ کی حرکتوں کو پہچانا اور ان کو اسی طرح دہرا دہرا کر بولنا سیکھ لیا۔ اب وہ باقاعدہ پڑھنے اور بولنے لگی۔ اس نے اپنی تعلیم میں اپنی انگلیوں کو آنکھ اور کان کا بدل بنا لیا۔ انگلیوں کی مدد سے اس نے پڑھنا سیکھا اور انگلیوں ہی کی مدد سے بولنا بھی۔

مس سولیون سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہیلن کیلر نے پرکن کے اندھوں کے کالج میں داخلہ لیا اور وہاں سے ۱۹۰۴ میں گریجویٹ ہو کر نکلی۔ اب اس نے لکھنا بھی سیکھ لیا۔ اس نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ دیکھنے اور سننے کی فطری استعداد سے محرومی کے باوجود اس نے تین زبانیں سیکھ لیں۔ انگریزی، فرانسیسی اور اسپینی۔ اس نے دنیا بھر کا سفر کر کے اندھوں کی تعلیم پر لکچر دیئے۔ اس کو ہارورڈ، گلاسگو، برلن اور دہلی کی یونیورسٹیوں نے اعزازی ڈگریاں دیں۔ اس کے علاوہ اس کو اور بہت سے عالمی اعزازات ملے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کوئی بڑا کارنامہ اکثر وہی لوگ انجام دیتے ہیں جو کسی بڑے حادثہ سے دو چار ہوئے ہوں۔ کسی کے ساتھ جب کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو وہ اس کے اندر کمی کے احساس کو بے پناہ حد تک جگا دیتا ہے۔ وہ اس چیز کو پانے کے لئے دوسروں سے زیادہ بے تاب ہو جاتا ہے جس کو وہ کسی وجہ سے دوسروں سے بہت کم پائے ہوئے ہے۔ اس کی یہ بیتابی اس کے اندر سوئی ہوئی بہت سی نئی نئی صلاحیتوں کو ابھار دیتی ہے۔ دوسرے لوگ جس چیز کو صرف جزئی محنت سے لینا چاہتے ہیں اس کو وہ اپنی ساری شخصیت لگا کر حاصل کرنے کے لئے بے چین ہو جاتا ہے۔ اس کی یہ تڑپ اس کے اندر ایک نیا انسان جگا دیتی ہے۔ "آنکھ" سے محروم ہونے والا اپنے "ہاتھ" سے پڑھنے کا راستہ نکال لیتا ہے۔ پیروں کو کھونے والا اپنی عقل کے ذریعہ اپنے سفر کی تدبیر کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ایک اعتبار سے گھاٹا اٹھانے والا دوسرے اعتبار سے نفع حاصل کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔

حادثات بظاہر امکانات کا خاتمہ ہیں۔ مگر وہ ایک نئے آغاز کا سبب بن سکتے ہیں۔ وہ آدمی کے اندر نیا ارادہ ابھارتے ہیں۔ اس کی چھپی ہوئی قوتوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ "پائے ہوئے" آدمیوں کے مقابلہ میں "کھوئے ہوئے" آدمیوں نے زیادہ بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں۔

ذمہ داری اپنی

ایک مفکر نے ایک مرتبہ بہت عمدہ بات کہی۔ اس نے کہا "آدمی ہر آن اپنے آپ کو ریڈیٹ (Radiate) کرتا رہتا ہے"۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی جو عمل کرتا ہے اس کے ذریعہ سے وہ ماحول کے اندر اپنا تعارف پھیلاتا رہتا ہے۔ جس طرح ریڈیم کا ایک ٹکڑا اپنے گرد و پیش اپنی شعاعیں بکھیرتا ہے اسی طرح انسان اپنے ہر رویہ سے دوسروں کو بتاتا رہتا ہے کہ وہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔

ایک دکان دار کا قصہ ہے۔ اس نے اپنے یہاں حساب لکھنے کے لئے ایک منیب رکھا۔ پہلے دن کام کرنے کے بعد منیب نے دکان دار کے یہاں غسل کیا اور اس کے بعد نل کو بند نہیں کیا، اس کو کھلا چھوڑ کر اپنے گھر چلا گیا۔ اگلے دن منیب آیا تو دکان دار نے اس کو مہینہ بھر کی پوری تنخواہ پیشگی دیتے ہوئے کہا "اب آپ کل سے میرے یہاں آنے کی زحمت نہ کیجئے گا"۔

"کیوں"، منیب نے حیرت کے ساتھ پوچھا "ابھی تو آپ نے صرف نل کو کھلا چھوڑا ہے"، دکان دار نے کہا "اسی طرح اگر کسی دن آپ نے میرے کاروبار میں کوئی دراز کھلا چھوڑ دیا تو میری ساری دولت اس کے راستہ بہہ

جائے گی اور میں دیوالیہ ہوکر رہ جاؤں گا "، ممکن ہے کہ دکان دار کے یہاں سے رخصت ہوتے ہوئے منیب نے اس کو دل ہی دل میں برا بھلا کہا ہو۔ اس کی نظر میں دکان دار بہت غلط آدمی ہو جس نے ذرا سی بات کو اتنا بڑھایا کہ اس کی ملازمت ختم کر دی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ میں اصل غلطی منیب کی ہے نہ کہ دکان دار کی ۔ منیب کی لیاقت کو کوئی دکان دار صرف بہی کھاتہ کے صفحات میں نہیں دیکھے گا بلکہ اس کے ہر چھوٹے بڑے عمل کو دیکھ کر اس کے بارے میں رائے قائم کرے گا۔

اگر ماحول آپ کے ساتھ غلط رویہ اختیار کرے تو ہرگز ماحول کی شکایت نہ کیجئے۔ کیونکہ ماحول تو صرف آپ کے عمل کا ردعمل پیش کرتا ہے۔ ماحول آپ کے ساتھ جو کچھ کر رہا ہے وہ خود آپ کے اس تعارف کا نتیجہ ہے جو آپ نے ماحول کے اندر کرایا تھا۔ اگر آپ ماحول کے اندر اپنا اچھا تعارف کرائیں تو ناممکن ہے کہ ماحول آپ سے اچھا سلوک نہ کرے۔ اگر ماحول کا سلوک آپ کی امیدوں کے خلاف ہو تو صرف اپنے کو قصوروار ٹھہرائیے۔ کیونکہ ماحول آپ کے ساتھ اس کے سوا اور کچھ نہیں کرتا کہ وہ خود آپ کے عمل کے مثنیٰ کو آپ کی طرف لوٹاتا ہے۔ جو آپ نے ماحول کو دیا ہے وہی وہ آپ کو دے دیتا ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

جس طرح بے شمار چھوٹے چھوٹے نقطے اور لکیریں مل کر ایک تصویر بناتے ہیں، اسی طرح آپ کا ہر لمحہ کا عمل دیکھنے والوں کے ذہن میں آپ کا نقش ترتیب دیتا رہتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ماحول کی نظر میں آپ کی ایک تصویر نہ بنے اور یہ بھی ناممکن ہے کہ آپ کے ساتھ ماحول کا معاملہ اس کے سوا کسی بنیاد پر ہو جو آپ نے اپنے روزانہ کے عمل سے اسے دیا ہے ۔ آدمی ہر وقت اپنی ایک تاریخ بنا رہا ہے۔ کسی کی تاریخ اچھی ہے اور کسی کی بری۔ کسی کی تاریخ کتابوں میں لکھی جاتی ہے اور کسی کی صرف مقامی داستان ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہر آدمی اپنے حلقہ میں ٹھیک ویسا ہی جانا جاتا ہے جیسا کہ اس نے اپنی تاریخ کے مطابق اپنے آپ کو بنایا ہے۔

آدمی ہر آن اپنے آپ کو ریڈیٹ کرتا رہتا ہے ——— اس قول کو یاد رکھئے، اور پھر آپ کو کبھی کسی سے شکایت نہ ہوگی، کیونکہ آپ خود بھی کسی کو شکایت کا موقع نہ دیں گے۔ اور اگر کسی کو شکایت کا موقع دیں گے تو پہلے سے اس کے لئے تیار رہیں گے کہ اس کی طرف سے آپ کو قابل شکایت بات برداشت کرنا ہے۔

آئینہ وہی دکھاتا ہے جو آپ فی الواقع ہیں۔ آئینہ میں کسی کے چہرہ پر دھبہ دکھائی دے تو وہ آئینہ سے نہیں لڑتا بلکہ خود اپنے دھبہ کو صاف کرتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دھبہ چہرہ پر ہے نہ کہ آئینہ پر۔ اسی طرح ماحول سے اگر آپ کو کوئی شکایت پیدا ہو تو ماحول پر غصہ نہ کیجئے۔ ماحول تو عین وہی چیز پیش کر رہا ہے جو آپ نے اپنے بارے میں ماحول کو بتایا ہے۔ ایسے ہر موقع پر اپنے آپ پر نظر ثانی کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اپنے آپ کو درست کرتے ہی ماحول کے آئینہ میں بھی آپ کی تصویر درست ہوگئی ہے ۔

یہ تقریر ۲۱-۲۳ اپریل ۱۹۸۱ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی

اے بنی آدم، ہم نے تم پر لباس اتارا جو تمھارے بدن کے قابل شرم حصوں کو ڈھانکے اور زینت بھی۔ اور تقوی کا لباس اس سے بھی بہتر ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ لوگ غور کریں۔ اے آدم کی اولاد، شیطان تم کو بہکا نہ دے جس طرح اس نے تمھارے ماں باپ کو جنت سے نکلوا دیا، اس نے ان کے لباس اتروائے تاکہ ان کو ان کے سامنے بے پردہ کر دے۔ وہ اور اس کے ساتھی تم کو ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انھیں نہیں دیکھتے۔ ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا دوست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے ۲۷-۲۶

دنیا کا نظام خدا نے اس طرح بنایا ہے کہ اس کی ظاہری چیزیں اس کی باطنی حقیقتوں کی علامت ہیں۔ ظاہری چیزوں پر غور کر کے آدمی چھپی ہوئی حقیقتوں تک پہنچ سکتا ہے۔ اسی قسم کی ایک چیز لباس ہے۔

خدا نے انسان کو لباس دیا جو اس کی حفاظت کرتا ہے اور اسی کے ساتھ اس کے حسن و وقار کو بڑھانے کا ذریعہ بھی ہے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ آدمی کے روحانی وجود کے لئے بھی اسی طرح ایک لباس ضروری ہے، یہ لباس تقویٰ ہے۔ تقویٰ آدمی کا معنوی لباس ہے۔ جو ایک طرف اس کو شیطان کے حملوں سے بچاتا ہے اور دوسری طرف اس کے باطن کو سنوار کر اس کو جنت کی لطیف و نفیس دنیا میں بسانے کے قابل بناتا ہے۔ یہ تقویٰ کا لباس کیا ہے۔ یہ ہے ——— اللہ کا خوف، حق کا اعتراف، اپنے لئے اور دوسروں کے لئے ایک معیار رکھنا، اپنے کو بندہ سمجھنا، تواضع کو اپنا شعار بنانا، دنیا میں گم ہونے کے بجائے آخرت کی طرف متوجہ رہنا۔ آدمی جب ان چیزوں کو اپنائے تو وہ اپنے اندرونی وجود کو ملبوس کرتا ہے اور اگر وہ اس کے خلاف رویہ اختیار کرے تو وہ اپنے اندرون کو ننگا کر لیتا ہے۔ ظاہری جسم کو کپڑے کا بنا ہوا لباس ڈھانکتا ہے اور باطنی جسم کو تقوی کا لباس۔

آدمی کو گمراہ کرنے کے لئے شیطان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اس کو بہکاتا ہے۔ وہ خدا کے ممنوعہ درخت کو ہر قسم کے خیر کا سرچشمہ بتاتا ہے۔ وہ ایسے معصوم راستوں سے اس کی طرف آتا ہے کہ آدمی کا گمان بھی نہیں جاتا کہ ادھر سے اس کی طرف گمراہی آ رہی ہوگی۔ شیطان آدمی کے تمام نازک مقامات کو جانتا ہے اور انھیں نازک مقامات سے وہ اس پر حملہ آور ہوتا ہے۔ کبھی ایک بے حقیقت نظریہ کو خوبصورت الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ کبھی ایک جزئی حقیقت کو کلی حقیقت کے روپ میں اس کے سامنے لاتا ہے۔ کبھی معمولی چیزوں میں فوائد کا خزانہ بتا کر سارے لوگوں کو اس کی طرف دوڑا دیتا ہے۔ کبھی ایک بے فائدہ حرکت میں ترقی کا راز بتاتا ہے۔ کبھی ایک تخریبی عمل کو تعمیر کے روپ میں پیش کرتا ہے۔

شیطان کن لوگوں کو بہکانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ وہ ان لوگوں پر کامیاب ہوتا ہے جو امتحان کے مواقع پر ایمان کا ثبوت نہیں دے پاتے۔ جو خدا کی نشانیوں پر غور نہیں کرتے۔ جو دلائل کی زبان میں بات کو سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ جنھیں اپنے ذاتی رجحانات کے مقابلہ میں حق کے تقاضے کو ترجیح دینا گوارا نہیں ہوتا۔ جن کو ایسی سچائی سچائی نظر نہیں آتی جس میں ان کے فائدوں اور مصلحتوں کی رعایت شامل نہ ہو۔ جنھیں وہ حق پسند نہیں آتا جو ان کی ذات کو نیچا کر کے خود ان کے مقابلہ میں اونچا ہونا چاہتا ہو۔

اور جب وہ کوئی فحش (کھلی برائی) کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طرح کرتے ہوئے پایا ہے اور خدا نے ہم کو اسی کا حکم دیا ہے۔ کہو، اللہ کبھی برے کام کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم اللہ کے ذمہ وہ بات لگاتے ہو جس کا تمھیں کوئی علم نہیں۔ کہو کہ میرے رب نے قسط کا حکم دیا ہے اور یہ کہ ہر نماز کے وقت اپنا رخ سیدھا رکھو۔ اور اسی کو پکارو اسی کے لئے دین کو خالص کرتے ہوئے۔ جس طرح اس نے تم کو پہلے پیدا کیا اسی طرح تم دوسری بار بھی پیدا ہو گے۔ ایک گروہ کو اس نے راہ دکھا دی اور ایک گروہ ہے کہ اس پر گمراہی ثابت ہو چکی۔ انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا رفیق بنایا اور گمان یہ رکھتے ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں ۲۸ — ۳۰

قدیم عرب میں لوگ ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کرتے اور اس کی حمایت میں یہ کہتے کہ خدا کی عبادت دنیا کی آلائشوں سے پاک ہو کر فطری حالت میں کرنا چاہئے۔ حالاں کہ برہنگی ایسی کھلی ہوئی برائی ہے جس کا برا ہونا عقل عام سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اسی طرح آدمی یہ عقیدہ قائم کر لیتا ہے کہ بے عملی اور سرکشی کے باوجود سفارشوں کی بنیاد پر خدا اس کو انعامات سے نوازے گا حالاں کہ وہ اپنے سرکش غلاموں کے معاملہ میں محض کسی کے کہنے سے ایسا نہیں کر سکتا۔ معمولی معمولی ناقابل فہم اعمال جن سے دنیا میں ایک گھر بھی نہیں بن سکتا ان سے یہ امید کر لیتا ہے کہ وہ آخرت میں اس کے لئے عالی شان محل تعمیر کر دیں گے۔ الفاظ کا شور و غل جس سے دنیا میں ایک درخت بھی نہیں اُگتا ان کے متعلق یہ خوش گمانی قائم کر لیتا ہے کہ وہ آخرت میں اس کے لئے جنت کے باغ اگا رہے ہیں۔

قسط سے مراد وہ منصفانہ روش ہے جو ہر ناپ میں پوری اترے، وہ عین وہی ہو جو کہ ہونا چاہئے۔ عبادت انسان کی ایک فطری خواہش ہے۔ وہ کسی کو سب سے اونچا مان کر اس کے آگے اپنے کو ڈال دینا چاہتا ہے۔ اس معاملہ میں قسط یہ ہوگا کہ آدمی صرف خدا کا عبادت گزار بنے جو اس کا خالق اور رب ہے۔ انسان کسی کو یہ مقام دینا چاہتا ہے کہ وہ اس کے لئے اعتماد کی بنیاد ہو۔ اس معاملہ میں قسط یہ ہوگا کہ آدمی خدا کو اپنی زندگی میں اعتماد کی بنیاد بنائے جو ساری طاقتوں کا مالک ہے۔ اسی طرح موت کے بعد ایک اور زندگی کو ماننا عین قسط ہے۔ کیونکہ آدمی جب پیدا ہوتا ہے تو وہ عدم سے وجود کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس لئے موت کے بعد دوبارہ پیدا ہونے کو ماننا عین اسی حقیقت کو ماننا ہے جو اول پیدائش کے وقت ہر آدمی کے ساتھ پیش آ چکی ہے

حق کے داعی کا انکار کرنے کے لئے آدمی قدیم بزرگوں کا سہارا لیتا ہے۔ قدیم بزرگ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی عظمت تاریخی طور پر قائم ہو چکی ہے۔ ہر آدمی کی نظر میں ان کا برسر حق ہونا مسلمہ امر بنا ہوا ہوتا ہے۔ دوسری طرف سامنے کا داعی حق ایک نیا آدمی ہوتا ہے جس کے ساتھ ابھی تاریخ کی تصدیق جمع نہیں ہوئی ہے۔ قدیم بزرگ کو آدمی اس کی تاریخ کے ساتھ دیکھ رہا ہوتا ہے اور نئے داعی کو اس کی تاریخ کے بغیر۔ وہ قدیم بزرگوں کے نام پر داعی حق کا انکار کر دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ عین ہدایت پر ہے۔ مگر اس طرح کی غلط فہمی کسی کے لئے خدا کے یہاں عذر نہیں بن سکتی۔ یہ خدا کے نام پر شیطان کی پیروی ہے نہ کہ حقیقۃً خدا کی پیروی۔

اے اولادِ آدم، ہر نماز کے وقت اپنا لباس پہنو اور کھاؤ پیو۔ اور حد سے تجاوز نہ کرو۔ بے شک اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ کہو اللہ کی زینت کو کس نے حرام کیا جو اس نے اپنے بندوں کے لئے نکالا تھا اور کھانے کی پاک چیزوں کو۔ کہو وہ دنیا کی زندگی میں بھی ایمان والوں کے لئے ہیں اور آخرت میں تو وہ خاص انہیں کے لئے ہوں گی۔ اسی طرح ہم اپنی آیتیں کھول کر بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو جاننا چاہیں۔ کہو میرے رب نے تو بس فحش باتوں کو حرام ٹھہرایا ہے وہ کھلی ہوں یا چھپی۔ اور گناہ کو اور ناحق کی زیادتی کو اور اس بات کو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرو جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ کے ذمہ ایسی بات لگاؤ جس کا تم علم نہیں رکھتے ۳۳ - ۳۱

عرب کے کچھ قبائل ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کرتے تھے اور اس کو بڑی قربت کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اسی طرح جاہلیت کے زمانہ میں کچھ لوگ ایسا کرتے کہ جب وہ حج کے لئے نکلتے تو بعض متعین چیزیں مثلاً بکری کا دودھ یا گوشت استعمال کرنا چھوڑ دیتے اور یہ خیال کرتے کہ وہ پرہیزگاری کا کوئی بڑا عمل کر رہے ہیں۔ یہ گمراہی کی وہ قسم ہے جس میں ہر زمانہ کے لوگ مبتلا رہے ہیں۔ ایسے افراد اپنی حقیقی اور مستقل زندگی میں دین کے تقاضوں کو شامل نہیں کرتے۔ البتہ چند مواقع پر کچھ غیر متعلق قسم کے بے فائدہ اعمال کا خصوصی اہتمام کر کے یہ مظاہرہ کرتے ہیں کہ وہ خدا کے دین پر معمولی جزئیات کی حد تک عمل کر رہے ہیں۔ وہ خدا کی مرضیات پر کامل ادائگی کی حد تک قائم ہیں۔

انسان کے بارے میں اللہ کی اصل مرضی تو یہ ہے کہ آدمی اسراف سے بچے، وہ خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز نہ کرے۔ وہ حلال کو حرام نہ کرے اور خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں کو اپنے لئے حلال نہ سمجھ لے۔ وہ فحش کاموں سے اپنے کو دور رکھے۔ وہ ان برائیوں سے بچے جن کا برا ہونا عقل عام سے ثابت ہوتا ہے۔ وہ بغی کی روش چھوڑ دے۔ جب بھی اس کے سامنے کوئی حق آئے تو ہر دوسری چیز کو نظر انداز کر کے وہ حق کو اختیار کرے۔ وہ شرک سے اپنے آپ کو پوری طرح پاک کرے، اللہ کے سوا کسی سے وہ برتر تعلق قائم نہ کرے جو صرف ایک خدا کا حق ہے۔ وہ ایسا نہ کرے کہ اپنی پسند کا ایک طریقہ اختیار کرے اور اس کو بلا دلیل خدا کی طرف منسوب کر دے، اپنے ذاتی دین کو خدا کا دین کہنے لگے۔ وہ پوری طرح خدا کا بندہ بن کر رہے، ایسی کوئی روش اختیار نہ کرے جو بندہ ہونے کے اعتبار سے اس کے لئے درست نہ ہو۔

آخرت میں کسی کو جو نعمتیں ملیں گی وہ بطور انعام ملیں گی۔ اس لئے وہ صرف ان خدا کے بندوں کے لئے ہوں گی جن کے لئے خدا جنت میں داخلہ کا فیصلہ کرے گا۔ مگر دنیا میں کسی کو جو نعمتیں ملتی ہیں وہ محدود مدت کے لئے بطور آزمائش ملتی ہیں۔ اس لئے یہاں کی نعمتوں میں ہر ایک کو اس کے پرچۂ امتحان کے بقدر حصہ مل جاتا ہے۔ اس امتحان میں پورا اترنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ آدمی خود سامانِ امتحان سے دوری اختیار کر لے۔ بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان کو مقرر کی ہوئی حدود کے مطابق استعمال کرے۔ وہ ان کے ملنے پر شکر کا جواب پیش کرے نہ کہ بے نیازی اور ڈھٹائی کا۔

اور ہر قوم کے لئے ایک مقررہ مدت ہے۔ پھر جب ان کی مدت آجائے گی تو وہ نہ ایک ساعت پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔ اے بنی آدم، اگر تمھارے پاس تمھیں میں سے رسول آئیں جو تم کو میری آیات سنائیں تو جو شخص ڈرا اور جس نے اصلاح کر لی ان کے لئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جو لوگ میری آیات کو جھٹلائیں اور ان سے تکبر کریں وہی لوگ دوزخ والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ پھر اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر بہتان باندھے یا اس کی نشانیوں کو جھٹلائے ان کے نصیب کا جو حصہ لکھا ہوا ہے وہ انھیں مل کر رہے گا یہاں تک کہ جب ہمارے بھیجے ہوئے ان کی جان لینے کے لئے ان کے پاس پہنچیں گے تو ان سے پوچھیں گے کہ اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے تھے کہاں ہیں۔ وہ کہیں گے کہ وہ سب ہم سے کھوئے گئے۔ اور وہ اپنے اوپر اقرار کریں گے کہ بے شک وہ انکار کرنے والے تھے ۳۷۔۳۴

موجودہ دنیا میں کسی کو کام کا موقع اسی وقت تک ہے جب تک اس کی امتحان کی مقررہ مدت پوری ہو جائے۔ فرد کی مدت اس کی عمر کے ساتھ پوری ہوتی ہے۔ مگر قوم کے بارے میں خدائی فیصلہ کے نفاذ کی اس قسم کی کوئی حد نہیں۔ اس کا فیصلہ اس بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ حق کے سامنے آنے کے بعد وہ اس کے ساتھ کیا معاملہ کرتی ہے۔ جس قوم کی مدت پوری ہو جائے اس کو کبھی غیر معمولی عذاب بھیج کر فنا کر دیا جاتا ہے اور کبھی اس کی سزا یہ ہوتی ہے کہ اس کو عزت و بڑائی کے مقام سے ہٹا دیا جائے۔

کسی آدمی کے لئے جنت یا دوزخ کا فیصلہ اس بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ اس کے سامنے جب حق آیا تو اس نے اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ جب بھی کوئی حق ایسے دلائل کے ساتھ سامنے آجائے جس کی صداقت پر آدمی کی عقل گواہی دے رہی ہو تو اس آدمی پر گویا خدا کی حجت پوری ہو گئی۔ اس کے بعد بھی اگر آدمی اس حق کو ماننے سے انکار کرتا ہے تو وہ یقیناً کبر کی وجہ سے ایسا کر رہا ہے۔ اپنے آپ کو بڑا رکھنے کی نفسیات اس کے لئے رکاوٹ بن گئی کہ وہ حق کو بڑا بنا کر اس کے مقابلہ میں اپنے کو چھوٹا بنانے پر راضی کرلے۔ ایسے آدمی کے لئے خدا کے یہاں جہنم کے سوا کوئی انجام نہیں۔

آدمی جب بھی حق کا انکار کرتا ہے تو وہ کسی اعتماد کے اوپر کرتا ہے۔ کسی کو دولت و اقتدار کا اعتماد ہوتا ہے۔ کوئی اپنی عزت و مقبولیت پر بھروسہ کئے ہوئے ہوتا ہے۔ کسی کو یہ اعتماد ہوتا ہے کہ اس کے معاملات اتنے درست ہیں کہ حق کو نہ ماننے سے اس کا کچھ بگڑنے والا نہیں۔ کسی کو یہ ناز ہوتا ہے کہ اس کی ذہانت نے اپنی بات کو عین خدا کی بات ثابت کرنے کے لئے شاندار الفاظ دریافت کر لئے ہیں۔ مگر یہ انسان کی بہت بڑی بھول ہے۔ وہ آزمائش کی چیزوں کو اعتماد کی چیز سمجھے ہوئے ہے۔ قیامت کے دن جب یہ تمام جھوٹے سہارے اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے تو اس وقت اس کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہ ہوگا کہ وہ محض سرکشی کی بنا پر حق کا انکار کرتا رہا۔ اگرچہ اپنے انکار کو جائز ثابت کرنے کے لئے وہ بہت سے اصولی الفاظ بولتا تھا۔

خدا کہے گا، داخل ہو جاؤ آگ میں جنوں اور انسانوں کے ان گروہوں کے ساتھ جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ جب بھی کوئی گروہ جہنم میں داخل ہوگا وہ اپنے ساتھی گروہ پر لعنت کرے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ اس میں جمع ہو جائیں گے تو ان کے پچھلے اپنے اگلوں کے بارے میں کہیں گے، اے ہمارے رب، یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہم کو گمراہ کیا پس تو ان کو آگ کا دہرا عذاب دے۔ خدا کہے گا کہ سب کے لئے دہرا ہے مگر تم نہیں جانتے۔ اور ان کے اگلے اپنے پچھلوں سے کہیں گے، تم کو ہم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ پس اپنی کمائی کے نتیجہ میں عذاب کا مزہ چکھو ۳۹ - ۳۸

اس آیت میں "امت" سے مراد گمراہ کرنے والے لیڈر اور "اُخت" سے مراد گمراہ ہونے والے عوام ہیں۔ آخرت میں جب ہر دور کے بے راہ قائدین اور ان کا ساتھ دینے والے بے راہ عوام جہنم میں ڈالے جائیں گے تو یہ ایک بڑا عبرت ناک منظر ہوگا۔ دنیا میں تو وہ ایک دوسرے کے بڑے خیر خواہ اور فدا کار بنے ہوئے تھے۔ قائدین اپنے عوام کی ہر خواہش کا احترام کرتے تھے اور عوام اپنے قائدین کو ہیرو بنائے ہوئے تھے۔ مگر جب جہنم کی آگ انھیں پکڑے گی تو ان کی آنکھوں سے تمام مصنوعی پردے ہٹ جائیں گے۔ اب ہر ایک دوسرے کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنے لگے گا۔ پیروی کرنے والے اپنے قائدین سے کہیں گے کہ تم پر لعنت ہو۔ تمھاری قیادت کیسی بری قیادت تھی جس نے چند دن کے جھوٹے تماشے دکھائے اور اس کے بعد ہم کو اتنی بڑی تباہی میں ڈال دیا۔ اس کے جواب میں قائدین اپنے پیروؤں سے کہیں گے کہ تم اپنی پسند کا ایک دین چاہتے تھے اور ایسا دین ہمارے پاس دیکھ کر ہمارے پیچھے دوڑ پڑے۔ ورنہ عین اسی زمانہ میں ایسے بھی خدا کے بندے تھے جو تم کو کامیابی کے سچے راستہ کی طرف بلاتے تھے۔ تم نے ان کی پکار سنی مگر تم نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

رہنما اپنے پیروؤں سے کہیں گے کہ تم کسی اعتبار سے ہم سے بہتر نہیں ہو۔ ہم نے اپنی خواہشوں کی خاطر قیادتیں کھڑی کیں اور تم نے بھی اپنی خواہشوں کی خاطر ہمارا ساتھ دیا۔ حقیقت کے اعتبار سے دونوں کا درجہ ایک ہے۔ اس لئے یہاں تم کو بھی وہی سزا بھگتنی ہے جو ہمارے لئے ہمارے اعمال کے سبب سے مقدر کی گئی ہے۔

پیروؤں کی جماعت اپنے رہنماؤں کے بارے میں خدا سے کہے گی کہ انھوں نے ہم کو گمراہ کیا تھا اس لئے ان کو ہمارے مقابلہ میں دگنا عذاب دیا جائے۔ جواب ملے گا کہ تمھارے رہنماؤں میں سے ہر ایک کو دگنا عذاب مل رہا ہے مگر تم کو اس کا احساس نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہنم میں جس کو جو عذاب ملے گا وہ اس کو اتنا زیادہ سخت معلوم ہوگا کہ وہ سمجھے گا کہ مجھ سے زیادہ تکلیف میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ہر شخص جس تکلیف میں ہوگا وہی تکلیف اس کو سب سے زیادہ معلوم ہوگی۔

دنیا میں مفاد پرست رہنما اور ان کے مفاد پرست پیرو خوب ایک دوسرے کے دوست بنے ہوئے ہیں۔ ہر ایک کے پاس دوسرے کے لئے عمدہ الفاظ ہیں۔ ہر ایک دوسرے کی بہتری میں لگا ہوا ہے۔ مگر آخرت میں ہر ایک دوسرے سے نفرت کرے گا، ہر ایک دوسرے کو شدید تر عذاب میں دھکیلنا چاہے گا۔

بے شک جن لوگوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے تکبر کیا ان کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ جنت میں داخل نہ ہوں گے جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں نہ گھس جائے۔ اور ہم مجرموں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔ ان کے لئے دوزخ کا بچھونا ہوگا اور ان کے اوپر اسی کا اوڑھنا ہوگا۔ اور ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے ——— ہم کسی شخص پر اس کی طاقت کے موافق ہی بوجھ ڈالتے ہیں ——— یہی لوگ جنت والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور ان کے سینہ کی ہر خلش کو ہم نکال دیں گے۔ ان کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور وہ کہیں گے کہ ساری تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے ہم کو یہاں تک پہنچایا اور ہم راہ پانے والے نہ تھے اگر اللہ ہم کو ہدایت نہ کرتا۔ ہمارے رب کے رسول سچی بات لے کر آئے تھے۔ اور آواز آئے گی کہ یہ جنت ہے جس کے تم وارث ٹھہرائے گئے ہو اپنے اعمال کے بدلے ۴۳-۴۰

خدا کے داعیوں کے مقابلہ میں کیوں ایسا ہوتا ہے کہ ان کے مدعو کے اندر متکبرانہ نفسیات جاگ اٹھتی ہیں اور وہ ان کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ داعی کی طرف صرف نشانی (دلیل) کا زور ہوتا ہے اور مدعو کی طرف مادی رونقوں کا زور۔ داعی دلیل کی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے اور اس کے مدعو مادیات کی بنیاد پر۔ دلیل کی طاقت دکھائی نہیں دیتی اور مادی طاقت آنکھوں سے دکھائی دیتی ہے۔ یہی فرق لوگوں کے اندر کبر کا مزاج پیدا کر دیتا ہے۔ لوگ داعی کو اپنے مقابلہ میں حقیر سمجھ کر اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ایسے لوگوں کا خدا کی رحمت میں داخل ہونا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا اونٹ کا سوئی کے ناکے میں داخل ہونا۔ انھوں نے خدا کو نظر انداز کیا اس لئے خدا نے بھی ان کو نظر انداز کر دیا۔ خدا نے اپنے داعی کے ذریعہ ان کو اپنی جھلکیاں دکھائیں۔ خدا ان کے سامنے دلائل کے روپ میں ظاہر ہوا۔ مگر انھوں نے اس کو بے وزن سمجھا۔ انھوں نے خدائی نشانیوں کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ ایسے لوگ کیوں کر خدا کی رحمتوں میں حصہ پا سکتے ہیں۔

دوزخیوں کا یہ حال ہوگا کہ جو لوگ دنیا میں ایک دوسرے کے دوست بنے ہوئے تھے وہ وہاں باہم متنفر ہو جائیں گے اور ایک دوسرے پر لعنت کر رہے ہوں گے۔ مگر جنت کا ماحول اس سے بالکل مختلف ہوگا۔ یہاں سب کے دل ایک دوسرے کے لئے کھلے ہوئے ہوں گے۔ ہر ایک کے دل میں دوسرے کے لئے محبت اور خیر خواہی کا چشمہ پھوٹ رہا ہوگا۔ دوزخی انسان کے لئے اس کا ماضی ایک دکھ بھری داستان بنا ہوا ہوگا اور جنتی انسان کے لئے اس کا ماضی ایک خوش گوار یاد۔

برے لوگوں کے لئے ان کی اگلی زندگی اس طرح شروع ہوگی کہ ان کا سینہ حسرت اور یاس کا قبرستان بنا ہوا ہوگا۔ ان کا ماضی ان کے لئے تلخ یادوں کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ دوسری طرف اچھے لوگوں کا یہ حال ہوگا کہ ان کی زبانیں اس خدا کی یاد سے تر ہوں گی جس کو انھوں نے بجا طور پر اپنا سہارا بنایا تھا۔ وہ حق کے علم برداروں کی دی ہوئی خبر کو عین سچا پا کر خوش ہو رہے ہوں گے کہ خدا کا یہ کتنا بڑا احسان تھا کہ اس نے انھیں ان داعیان حق کا ساتھ دینے کی توفیق عطا فرمائی۔

اور جنت والے دوزخ والوں کو پکاریں گے کہ ہم سے ہمارے رب نے جو وعدہ کیا تھا ہم نے اس کو سچا پایا، کیا تم نے بھی اپنے رب کے وعدہ کو سچا پایا۔ وہ کہیں گے ہاں۔ پھر ایک پکارنے والا دونوں کے درمیان پکارے گا کہ اللہ کی لعنت ہو ظالموں پر۔ جو اللہ کی راہ سے روکتے تھے اور اس میں کجی ڈھونڈتے تھے اور وہ آخرت کے منکر تھے ۴۵-۴۴

ان آیات میں قدیم زمانہ کے کچھ لوگوں نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ جنت اور جہنم تو ایک دوسرے سے بہت زیادہ دور واقع ہوں گی، جنت آسمانوں کے اوپر ہوگی اور دوزخ سب سے نیچے تحت الثریٰ میں۔ پھر جنت والوں کی آواز جہنم والوں تک کس طرح پہنچے گی۔ مگر اب ریڈیو اور ٹیلی وژن کے دور میں یہ سوال کوئی سوال نہیں۔ آج انسان یہ جان چکا ہے کہ دور کے فاصلوں سے کسی کو دیکھنا بھی ممکن ہے اور اس کی آواز کو سننا بھی۔ جو بات قدیم انسان کو ناقابل فہم نظر آتی تھی وہ آج کے انسان کے لئے خود اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں پوری طرح قابل فہم ہو چکی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی کوئی بات اگر آج کی معلومات کی روشنی میں سمجھ میں نہ آرہی ہو تو اس بنا پر اس کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگانا چاہئے۔ عین ممکن ہے کہ علم کے اضافہ کے بعد کل وہ چیز ایک جانی پہچانی چیز بن جائے جو آج بظاہر ان جان چیز کی طرح دکھائی دے رہی ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ آخرت میں جنتیوں اور دوزخیوں کے درمیان متعلق موجودہ قسم کے ریڈیو اور ٹیلی وژن کے ذریعہ قائم ہوگا۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جدید دریافتوں نے اس بات کو قابل فہم بنا دیا ہے کہ خدا کی کائنات میں ایسے انتظامات بھی ممکن ہیں کہ ایک دوسرے سے بہت دور رہ کر بھی دو آدمی ایک دوسرے کو دیکھیں اور ایک دوسرے سے بخوبی طور پر بات کریں۔

کسی دلیل کا وزن آدمی اسی وقت سمجھ پاتا ہے جب کہ وہ اس کے بارے میں سنجیدہ ہو۔ جو لوگ آخرت کو اہمیت نہ دیں وہ آخرت سے متعلق دلائل کا وزن بھی محسوس نہیں کر پاتے۔ آخرت کی بات ان کے سامنے انتہائی مضبوط دلائل کے ساتھ آتی ہے۔ مگر اس کے بارے میں ان کا غیر سنجیدہ ذہن اس کے اندر کوئی نہ کوئی عیب تلاش کر لیتا ہے۔ وہ طرح طرح کے اعتراض نکال کر خود بھی شک و شبہ میں مبتلا ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی شک و شبہ میں مبتلا کرتے ہیں۔ ایسے لوگ خدا کی نظر میں سخت مجرم ہیں۔ وہ آخرت میں صرف خدا کی لعنت کے مستحق ہوں گے خواہ دنیا میں وہ اپنے کو خدا کی رحمتوں کا سب سے بڑا حق دار سمجھتے رہے ہوں۔

کوئی دلیل خواہ کتنی ہی وزنی اور قطعی ہو، آدمی کے لئے ہمیشہ یہ موقع رہتا ہے کہ وہ کچھ خوبصورت الفاظ بول کر اس کی صداقت کے بارے میں لوگوں کو شبہ کر دے۔ عوام ایک حقیقی دلیل اور ایک لفظی شوشہ میں فرق نہیں کر پاتے اس لئے وہ اس قسم کی باتیں سن کر حق سے بدک جاتے ہیں۔ مگر جو لوگ سمجھنے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود اس طرح کے شوشے نکال کر لوگوں کو حق سے بدکاتے ہیں وہ آخرت کے دن خدا کی رحمتوں سے آخری حد تک دور ہوں گے۔

اور دونوں کے درمیان ایک آڑ ہوگی۔ اور اعراف کے اوپر کچھ لوگ ہوں گے جو ہر ایک کو ان کی علامت سے پہچانیں گے اور وہ جنت والوں کو پکار کر کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو، وہ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے مگر وہ امیدوار ہوں گے۔ اور جب دوزخ والوں کی طرف ان کی نگاہ پھیری جائے گی تو وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہم کو شامل نہ کرنا ان ظالم لوگوں کے ساتھ۔ اور اعراف والے ان اشخاص کو پکاریں گے جنھیں وہ ان کی علامت سے پہچانتے ہوں گے۔ وہ کہیں گے کہ تمہارے کام نہ آئی تمہاری جماعت اور تمہارا اپنے کو بڑا سمجھنا۔ کیا یہی وہ لوگ ہیں جن کی نسبت تم قسم کھا کر کہتے تھے کہ ان کو کبھی اللہ کی رحمت نہ پہنچے گی۔ جنت میں داخل ہو جاؤ، اب نہ تم پر کوئی ڈر ہے اور نہ تم غم گین ہوگے ۴۹۔۴۶

دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ خدا کی نعمتوں اور اس کی جانب سے آئی ہوئی سختیوں سے مومن و مسلم سب یکساں دوچار ہوتے ہیں۔ مگر آخرت میں ایسا نہیں ہوگا۔ وہاں دونوں کے درمیان "آڑ" قائم ہو جائے گی۔ وہاں مومنین کو ملی ہوئی نعمتوں کی کوئی خوشبو کافروں کو نہیں ملے گی اور اسی طرح کافروں کو ملی ہوئی تکلیفوں کا کوئی اثر جنت والوں تک نہیں پہنچے گا۔

عرف کے معنی عربی زبان میں بلندی کے ہوتے ہیں۔ اعراف والے کا مطلب ہے بلندیوں والے۔ اس سے مراد پیغمبروں اور داعیوں کا گروہ ہے جنھوں نے مختلف وقتوں میں لوگوں کو حق کا پیغام دیا۔ قیامت میں جب لوگوں کا حساب ہوگا اور ہر ایک کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ اس کا انجام کیا ہونے والا ہے اور داعیٔ حق کی بات جو وہ دنیا میں کہتا تھا آخری طور پر صحیح ثابت ہو چکی ہوگی اس وقت ہر داعی اپنی قوم کو خطاب کرے گا۔ خدا کے حکم سے آخرت میں ان کے لئے اونچا اسٹیج مہیا کیا جائے گا جس پر کھڑے ہو کر وہ پہلے اپنے ماننے والوں کو خطاب کریں گے۔ یہ لوگ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے مگر وہ اس کے امیدوار ہوں گے۔ اس کے بعد ان کا رخ ان کے جھٹلانے والوں کی طرف کیا جائے گا۔ وہ ان کی بری حالت دیکھ کر کمال عبدیت کی وجہ سے کہہ اٹھیں گے کہ خدایا ہمیں ان ظالموں میں شامل نہ کر۔ وہ گروہ منکرین کے لیڈروں کو ان کے چہرہ کی ہیئت سے پہچان لیں گے اور ان سے کہیں گے کہ تم کو اپنے جس جتھے اور اپنے جس ساز و سامان پر گھمنڈ تھا اور جس کی وجہ سے تم نے ہمارے پیغام حق کو جھٹلا دیا وہ آج تمہارے کچھ کام نہ آسکا۔

حق کا انکار کرنے والے وقت کے قائم شدہ نظام کے سایہ میں ہوتے ہیں۔ اس دنیا میں ان کی حیثیت ہمیشہ مضبوط ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ حق کے داعیوں کا ساتھ دیتے ہیں ان کا ساتھ دینا صرف اس قیمت پر ہوتا ہے کہ وقت کے جمے ہوئے نظام کی سرپرستی انھیں حاصل نہ رہے۔ اس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ جو لوگ حق کو نہیں مانتے وہ ماننے والوں کی بے چارگی کو دیکھ کر ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کیا یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کی جنتوں میں جائیں گے۔ اصحاب اعراف قیامت میں ایسے لوگوں سے کہیں گے کہ اب دیکھ لو کہ حقیقت کیا تھی اور تم اس کو کیا سمجھے ہوئے تھے۔ بالآخر کون کامیاب رہا اور کون ناکام ٹھہرا۔

اور دوزخ کے لوگ جنت والوں کو پکاریں گے کہ کچھ پانی ہم پر ڈال دو یا اس میں سے جو اللہ نے تمھیں کھانے کو دے رکھا ہے۔ وہ کہیں گے کہ اللہ نے ان دونوں چیزوں کو کافروں کے لئے حرام کر دیا ہے۔ وہ جنھوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا لیا تھا اور جن کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا تھا۔ پس آج ہم ان کو بھلا دیں گے جس طرح انھوں نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا اور جیسا کہ وہ ہماری نشانیوں کا انکار کرتے رہے ۵۱-۵۰

دنیا دو قسم کی غذاؤں کا دسترخوان ہے۔ ایک دنیوی اور دوسری اخروی۔ ایک انسان وہ ہے جس کی روح کی غذا یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو نمایاں ہوتے ہوئے دیکھے۔ دنیا کی رونقیں اپنے گرد پا کر اسے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ مادی ساز و سامان کا مالک ہو کر وہ اپنے کو کامیاب سمجھتا ہے۔ ایسا آدمی خدا اور آخرت کو بھولا ہوا ہے۔ اس کے سامنے خدا کی بات آئے گی تو وہ اس کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دے گا۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سرسری سلوک کرے گا جیسے وہ کوئی سنجیدہ معاملہ نہ ہو بلکہ محض کھیل تماشا ہو۔

ایسے آدمی کے لئے آخرت کے انعامات میں کوئی حصہ نہیں۔ اس نے اپنے اندر ایک ایسی روح کی پرورش کی جس کی غذا صرف دنیا کی چیزیں بن سکتی تھیں۔ پھر آخرت کی چیزوں سے اس کی روح کیونکر اپنی خوراک پا سکتی ہے، جو انسان آج آخرت میں نہ جیا ہو اس کے لئے آخرت، کل کے دن بھی زندگی کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔

دوسرا انسان وہ ہے جو غیبی حقیقتوں میں گم رہا ہو۔ جس کی روح کو آخرت کی یاد میں لذت ملی ہو۔ جس کی غذا یہ رہی ہو کہ وہ خدا میں جیے اور خدا کی فضاؤں میں سانس لے۔ یہی وہ انسان ہے جس کے لئے آخرت رزق کا دسترخوان بنے گی۔ وہ جنت کے باغوں میں اپنے لئے زندگی کا سامان حاصل کرے گا۔ اس نے عالم غیب میں خدا کو پایا تھا اس لئے عالم شہود میں بھی وہ خدا کو پالے گا۔

خدا کی دنیا میں آدمی خدا کو کیوں بھلا دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا ایسی نشانیوں کے ساتھ سامنے آتا ہے جو صرف سوچنے سے ذہن کی پکڑ میں آتی ہیں، جب کہ دنیا کی چیزیں آنکھوں کے سامنے اپنی تمام رونقوں کے ساتھ موجود ہوتی ہیں۔ آدمی ظاہری چیزوں کی طرف جھک جاتا ہے اور خدا کی طرف اشارہ کرنے والی نشانیوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ مگر ایسا ہر عمل دنیا کی قیمت پر آخرت کو چھوڑنا ہے۔ اور جس نے موت سے پہلے والی زندگی میں آخرت کو چھوڑا وہ موت کے بعد والی زندگی میں بھی آخرت سے محروم رہے گا۔

اللہ جب ایک چیز کو حق کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے لائے اور وہ اس کو اہمیت نہ دیں، وہ اس کے ساتھ غیر سنجیدہ معاملہ کریں تو یہ دراصل خود خدا کو غیر اہم سمجھنا اور اس کے ساتھ غیر سنجیدہ معاملہ کرنا ہے۔ دنیا میں حق کو نظر انداز کرنے سے آدمی کا کچھ بگڑتا نہیں، حق کی پشت پر جو خدائی طاقتیں ہیں وہ ابھی غیب میں ہونے کی وجہ سے اس کو نظر نہیں آتیں۔ یہ صورت حال اس کو دھوکے میں ڈال دیتی ہے۔ جو لوگ اس طرح حق کو نظر انداز کریں وہ یہ خطرہ مول لیتے ہیں کہ خدا بھی آخرت کے دن انھیں نظر انداز کر دے۔

اور ہم ان لوگوں کے پاس ایک ایسی کتاب لے آئے ہیں جس کو ہم نے علم کی بنیاد پر مفصل کیا ہے، ہدایت اور رحمت بنا کر ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائیں۔ کیا اب وہ اسی کے منتظر ہیں کہ اس کا مضمون ظاہر ہو جائے۔ جس دن اس کا مضمون ظاہر ہو جائے گا تو وہ لوگ جو اس کو پہلے بھولے ہوئے تھے بول اٹھیں گے کہ بے شک ہمارے رب کے پیغمبر حق لے کر آئے تھے۔ پس اب کیا کوئی ہماری سفارش کرنے والے ہیں کہ ہماری سفارش کریں یا ہم کو دوبارہ واپس ہی بھیج دیا جائے تاکہ ہم اس سے مختلف عمل کریں جو ہم پہلے کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اور ان سے گم ہو گیا وہ جو وہ گھڑتے تھے ۵۲-۵۳

قرآن آدمی کو موت کے بعد آنے والی زندگی سے ڈراتا ہے، وہ آخرت کے حساب کتاب سے لوگوں کو آگاہ کرتا ہے۔ مگر آدمی چوکنا نہیں ہوتا۔ قرآن کی یہ خبریں اگرچہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ وہ کائنات کی اٹل حقیقتیں ہیں۔ تاہم ابھی وہ واقعات کی صورت میں ظاہر نہیں ہوئیں، ابھی وہ مستقبل کے پردہ میں چھپی ہوئی ہیں۔ اس بنا پر غافل انسان یہ سمجھتا ہے کہ یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں۔ وہ ان کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے۔

مگر یہ باتیں خدا کی طرف سے ہیں جو تمام باتوں کا جاننے والا ہے۔ جن لوگوں نے اپنی فطرت کو بگاڑا نہیں ہے۔ جن کی آنکھوں پر مصنوعی پردے نہیں پڑے ہوئے ہیں وہ قرآن کی ان باتوں کو اپنے دل کی آواز پائیں گے۔ وہ ان کو عین وہی چیز معلوم ہوگی جس کی تلاش ان کی فطرت پہلے سے کر رہی تھی۔ قرآن ان کے لئے زندگی اور یقین کا خزانہ بن جائے گا۔

اس کے برعکس حال ان لوگوں کا ہے جو قرآن کی آگاہی کو کوئی سنجیدہ چیز نہیں سمجھتے۔ وہ اپنی اسی غفلت کی حالت میں پڑے رہیں گے یہاں تک کہ وہ وقت ان پر پھٹ پڑے جس کی خبر انھیں دی جا رہی ہے۔ اس وقت آدمی اچانک دیکھے گا کہ وہ بالکل بے سہارا ہو چکا ہے۔ وہ جن مسائل کو اہم سمجھ کر ان میں الجھا ہوا تھا اس دن وہ بالکل بے حقیقت نظر آئیں گے۔ وہ جن چیزوں پر بھروسہ کئے ہوئے تھا وہ سب اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہوں گے۔ وہ جن امیدوں پر جی رہا تھا وہ سب جھوٹی خوش خیالیاں ثابت ہوں گی۔

آخرت کا مسئلہ آج محض ایک نظریہ ہے، وہ بظاہر کوئی سنگین مسئلہ نہیں۔ اس لئے آدمی اس کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہو پاتا۔ مگر موت کے بعد آنے والی زندگی میں جب آخرت اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ پھٹ پڑے گی، اس وقت ہر آدمی اس بات کو ماننے پر مجبور ہوگا جس کو وہ اس سے پہلے ماننے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت آدمی جان لے گا کہ اس سے پہلے جو بات دلیل کی زبان میں کہی جا رہی تھی وہ عین حقیقت تھی مگر میں اس کے بارے میں سنجیدہ نہ ہو سکا اس لئے میں اس کو سمجھ بھی نہ پایا۔

جب وہ تمام چیزیں آدمی کا ساتھ چھوڑ دیں گی جن کو وہ دنیا میں اپنا سہارا بنائے ہوئے تھا تو وہ چاہے گا کہ دنیا میں اسے دوبارہ بھیج دیا جائے تاکہ وہ صحیح زندگی گزارے۔ مگر زندگی کا یہ موقع کسی کو دوبارہ ملنے والا نہیں۔

بے شک تمھارا رب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ پھر وہ عرش پر متمکن ہوا۔ وہ اڑھاتا ہے رات کو دن پر، دن اس کے پیچھے لگا آتا ہے دوڑتا ہوا۔ اور اس نے پیدا کئے سورج اور چاند اور ستارے، سب تابعدار ہیں اس کے حکم کے۔ یاد رکھو، اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور حکم کرنا۔ بڑی برکت والا ہے اللہ جو رب ہے سارے جہان کا۔ اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے۔ یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور زمین میں فساد نہ کرو اس کی اصلاح کے بعد۔ اور اسی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ۔ یقیناً اللہ کی رحمت نیک کام کرنے والوں سے قریب ہے ۵۶ - ۵۴

زمین و آسمان اور اس کی تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا خدا ہے۔ اس پیدا کرنے کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ وہ تمام چیزوں کو بنا کر ان کو انتشار کی حالت میں چھوڑ دیتا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے تمام چیزوں کو ایک حد درجہ کامل اور حکیمانہ نظام کے تحت جوڑا اور ان کو اس طرح چلایا کہ ہر چیز ٹھیک اسی طرح کام کرتی ہے جیسا کہ مجموعی مصلحت کے اعتبار سے اس کو کرنا چاہئے۔

انسان بھی اسی دنیا کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ پھر ایسی اصلاح یافتہ دنیا میں اس کا رویہ کیا ہونا چاہئے۔ اس کا رویہ وہی ہونا چاہئے جو بقیہ تمام چیزوں کا ہے۔ وہ بھی اپنے آپ کو اسی خالق کے منصوبے میں دے دے جس کے منصوبہ میں بقیہ کائنات پوری تابعداری کے ساتھ اپنے آپ کو دئے ہوئے ہے۔

کائنات کی تمام چیزیں احسان (حسن کارکردگی) کی حد تک اپنے آپ کو خدا کے منصوبہ میں شامل کئے ہوئے ہیں۔ اس لئے انسان کو بھی احسان کی حد تک اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دینا چاہئے۔ یہاں کوئی چیز بھی اعتدار (اپنی مقررہ حد سے تجاوز) نہیں کرتی۔ اس لئے انسان کے واسطے بھی لازم ہے کہ وہ عدل اور حق کی خدائی حدوں سے تجاوز نہ کرے۔ مزید یہ کہ انسان نطق اور شعور کی اضافی خصوصیات رکھتا ہے۔ اس لئے نطق اور شعور کی سطح پر بھی اس کی حوالگی رب کا اظہار ہونا ضروری ہے۔ انسان کے اندر خدا کی معرفت اتنی گہرائی تک اتر جانا چاہئے کہ اس کی زبان سے بار بار اس کا اظہار ہونے لگے۔ وہ خدا کو اس طرح پکارے جس طرح بندہ اپنے خالق و مالک کو پکارتا ہے۔ اس کو خدا کی خدائی کا اتنا ادراک ہونا چاہئے کہ خدا کے سوا اس کی امیدوں اور اس کے اندیشوں کا کوئی مرجع باقی نہ رہے۔ وہ خدا ہی سے ڈرے اور اسی سے اپنی تمام تمنائیں وابستہ کرے۔ خدا کے ساتھ خوف اور طمع کو وابستہ کرنا خدا کی تابعداری کی آخری اور انتہائی صورت ہے۔

بندے کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس کو خدا کی رحمت حاصل ہو، مگر یہ رحمت صرف ان اشخاص کا حصہ ہے جو اللہ کے ساتھ اپنے آپ کو اتنا زیادہ متعلق کر لیں کہ ان کے تمام جذبات کا رخ اللہ کی طرف ہو جائے۔ وہ اسی کو پکاریں اور اسی کے ساتھ عاجزی کریں۔ ان کو پانے کی امید اسی سے ہو اور چھننے کا ڈر بھی اسی سے۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے خدا کی قربت چاہی اس لئے خدا نے بھی ان کو اپنے قریب جگہ دے دی۔

اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے خوش خبری بنا کر بھیجتا ہے۔ پھر جب وہ بوجھل بادلوں کو اٹھا لیتی ہیں تو ہم اس کو کسی خشک سرزمین کی طرف ہانک دیتے ہیں۔ پھر ہم اس کے ذریعہ پانی اتارتے ہیں۔ پھر ہم اس کے ذریعہ سے ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں۔ اسی طرح ہم مُردوں کو نکالیں گے، تاکہ تم غور کرو۔ اور جو زمین اچھی ہے اس کی پیداوار نکلتی ہے اس کے رب کے حکم سے اور جو زمین خراب ہے اس کی پیداوار کم ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح ہم اپنی نشانیاں مختلف پہلوؤں سے دکھاتے ہیں ان کے لئے جو شکر کرنے والے ہیں ۵۷-۵۸

دنیا کو خدا نے اس طرح بنایا ہے کہ اس کے مادی واقعات اس کے روحانی پہلوؤں کی تمثیل بن گئے ہیں۔ جب کہیں بارش ہوتی ہے تو اس مقام کے ہر حصہ تک اس کا پانی یکساں طور پر پہنچتا ہے۔ مگر فیض اٹھانے کے اعتبار سے مختلف زمینوں کا حال مختلف ہوتا ہے۔ کوئی حصہ وہ ہے کہ پانی اس کو ملا تو اس کے اندر سے ایک لہلہاتا ہوا چمنستان نکل آیا۔ دوسری طرف کسی حصہ کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ بارش پاکر بھی بے فیض پڑا رہتا ہے۔ وہاں جھاڑ جھنکاڑ کے سوا کچھ نہیں اگتا۔

یہی حال اس روحانی بارش کا ہے جو خدا کی طرف سے ہدایت کی صورت میں اتری ہے۔ اس ہدایت کا پیغام ہر آدمی کے کانوں تک پہنچتا ہے۔ مگر فائدہ ہر ایک کو اپنی اپنی استعداد کے بقدر ملتا ہے۔ جس کے اندر قبول حق کی صلاحیت زندہ ہے وہ اس سے بھرپور فیض حاصل کرتا ہے۔ اس سے اس کو ایک نئی زندگی ملتی ہے۔ اس کی فطرت اچانک جاگ اٹھتی ہے۔ اس کا ربط اپنے مالک اعلیٰ سے قائم ہو جاتا ہے۔ اس کی خشک نفسیات میں ربانی کیفیات کا باغ کھل اٹھتا ہے۔

اس کے برعکس حال اس شخص کا ہوتا ہے جس نے اپنی فطری اسلامتی کو کھو دیا ہو۔ ہدایت کی بارش اپنے تمام بہترین امکانات کے باوجود اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی۔ اس کے بعد بھی وہ ویسا ہی خشک پڑا رہتا ہے جیسا کہ وہ اس سے پہلے تھا۔ اور اگر اس کے اندر کوئی فصل نکلتی ہے تو وہ بھی جھاڑ جھنکاڑ کی فصل ہوتی ہے۔ ہدایت کی بارش پاکر اس کے اندر سے حسد، کبر، حجت بازی، حق کی مخالفت جیسی چیزیں جاگ اٹھتی ہیں نہ کہ حق کا اعتراف کرنے اور اس کا ساتھ دینے کی۔

بارش کے پانی کو قبول کرنے کے لئے زمین کا خشک ہونا ضروری ہے۔ جو زمین خشک نہ ہو، پانی اس کے اوپر سے گزر جائے گا، وہ اس کے اندر داخل نہیں ہوگا۔ اسی طرح خدا کی ہدایت صرف اس آدمی کے اندر جڑ پکڑتی ہے جو اس کا طالب ہو، جس نے اپنی روح کو غیر خدائی باتوں سے خالی کر رکھا ہو۔ اس کے برعکس جو شخص خدا کی ہدایت سے بے پروا ہو، جس کا دل دوسری دلچسپیوں یا دوسری عظمتوں میں اٹکا ہوا ہو، اس کے پاس خدا کی ہدایت آئے گی مگر وہ اس کے اندرون میں داخل نہیں ہوگی، وہ اس کی روح کی غذا نہیں بنے گی، وہ اس کی فطرت کی زمین کو سیراب کر کے اس کے اندر خدا کا باغ نہیں اگائے گی۔

جدید علم کلام

جدید علم کلام کا مطلب ہے جدید ذہن کی رعایت سے دین کی باتوں کو مدلل کرنا، جدید طرز استدلال میں اسلامی تعلیمات کو بیان کرنا۔ اب دیکھئے کہ جدید ذہن کیا ہے۔ جدید ذہن دراصل سائنسی ذہن کا دوسرا نام ہے۔ سائنسی ذہن کا مطلب حقائق کو اہمیت دینے والا ذہن ہے۔ سائنس کے انقلاب نے موجودہ زمانہ میں انسانی فکر میں جو تبدیلی کی ہے وہ یہ ہے کہ جو بات کہی جائے تجربہ اور مشاہدہ کی بنیاد پر کہی جائے نہ کہ مفروضات اور قیاسات کی بنیاد پر۔ موجودہ زمانہ میں جو انقلاب آیا ہے وہ حقائق فطرت کے مطالعہ سے آیا ہے۔ بائیسکل سے لے کر ہوائی جہاز تک اور بجلی کے لیمپ سے لے کر بڑے بڑے صنعتی کارخانوں تک ہر چیز فطری حقائق کی بنیاد پر چل رہی ہے۔ یہی انقلاب موجودہ زمانہ کا غالب انقلاب ہے۔ اس نے زندگی کے تمام پہلوؤں پر اثر ڈالا ہے۔ اسی نے موجودہ زمانہ میں اسلوب کلام کو بھی بدل دیا ہے۔ انسان ہزاروں سال سے پراسرار عملیات کی بنیاد پر لوہے کو سونا بنانے کی کوشش کرتا رہا مگر وہ کامیاب نہیں ہوا۔ اب حقائق فطرت کو دریافت کر کے وہ لوہے کو مشینوں میں تبدیل کر رہا ہے جو سونے سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔ ایسی حالت میں بالکل قدرتی بات ہے کہ آج کا انسان حقائق فطرت کی بنیاد پر ثابت ہونے والی بات کو سب سے زیادہ باوزن سمجھے۔ آج کے انسان نے جو ترقیاں کی ہیں وہ حقائق کی بنیاد پر کی ہیں اس لئے آج کا انسان انھیں باتوں کو اہمیت دیتا ہے جو حقائق کے زور پر ثابت ہوتا ہو۔

قدیم اور جدید ذہن کے فرق کو ایک سادہ مثال سے سمجھئے۔ پچاس سال پہلے اطبا کے یہاں اس قسم کے الفاظ بے حد پرکشش سمجھے جاتے تھے ——— خاندانی نسخہ، پشتینی علاج، شاہی ترکیب سے بنی ہوئی دوا۔ کسی دوا یا منجن کے بارے میں یہ الفاظ بولنے کا مطلب یہ تھا کہ اس میں پراسرار خواص چھپے ہوئے ہیں۔ مگر آج ان الفاظ کے اندر کوئی قیمت نہیں۔ آج کا ڈاکٹر کسی دوا یا کسی ٹوتھ پیسٹ کی اہمیت کو بتانے کے لئے "قدیمی نسخہ" کی اصطلاح نہیں بولے گا۔ وہ کہے گا کہ یہ سائنسی طریقوں سے بنایا گیا ہے۔ سائنسی طریقہ کا مطلب یہ ہے کہ اس کی افادیت کو معلوم تجربات و مشاہدات کے ذریعہ جانا جا چکا ہے۔ حتی کہ اگر کوئی چاہے تو ان تجربات کو دہرا کر دوبارہ ان کے نتائج کی صحت کی تصدیق کر سکتا ہے۔ جب کہ خاندانی علاج کا مطلب یہ تھا کہ اس کے طبی خواص ہر ایک کے لئے قابل دریافت نہیں ہیں۔ دوا اور مرض کے درمیان تعلق کو متعین تجربات کے ذریعہ معلوم نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی اہمیت بس یہ ہے کہ وہ قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ آج کا انسان اسی منجن کو استعمال کرنا پسند کرتا ہے جو سائنسی، بالفاظ دیگر، فطری حقیقتوں کی پیروی کرتے ہوئے بنا ہو۔ اسی طرح وہ صرف ان افکار کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے جن کا برحق ہونا فطری حقائق کے ذریعہ معلوم ہوا ہو۔

سائنسی انقلاب سے پہلے انسانی فکر کی بنیاد فلسفیانہ قیاسات پر قائم تھی، سائنسی انقلاب کے بعد انسانی فکر کی بنیاد معلوم حقائق و واقعات پر رکھی گئی ہے۔ اسی سے قدیم علم کلام اور جدید علم کلام کا فرق سمجھا جا سکتا ہے۔ قدیم علم کلام کی بنیاد فلسفیانہ طرز استدلال پر تھی، جدید علم کلام کی بنیاد فطری طرز استدلال پر ہے۔ پہلے قیاسی منطق کے ذریعہ بات کو ثابت کیا جاتا تھا۔ اب وہ زمانہ ہے کہ بات کو حقیقی شواہد کے ذریعہ ثابت کیا جائے۔

جدید ذہن کی اس مختصر وضاحت کے بعد اب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جدید طرز استدلال دوسروں کے لئے خواہ جدید ہو مگر اسلام کے لئے وہ جدید نہیں۔ اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ قرآن کا طرز استدلال عین وہی ہے جس کو موجودہ زمانہ میں حقائق فطری سے استدلال کہا جاتا ہے تو یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ جدید علم کلام دراصل قرآنی علم کلام ہے۔ جدید علم کلام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ قرآنی کلامیات کی طرف لوٹنا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب قدیم عراق کی مشرک قوم کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی تو سورج، چاند اور ستاروں کے مشاہدات سے اپنی دعوت کے اوپر دلیل قائم کی۔ آنجناب کا یہ واقعہ سورہ انعام (رکوع ۹) میں بیان ہوا ہے۔ وہاں قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: وتلک حجتنا آتینا ھا ابراھیم علیٰ قومہ (یہ ہماری دلیل ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے اوپر عطا کی) یہاں حجتنا کا لفظ بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے جو انداز کلام اختیار کیا وہ خدائی انداز کلام تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حجت خداوندی یا استدلال الٰہی کا طریقہ یہ ہے کہ کائنات کے معلوم و مشہود حقائق سے استدلال کیا جائے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ خدا نے اپنی کتاب میں جو تعلیم قلمی طور پر دی ہے، ساری کائنات کو اس کے حق میں عملی دلیل بنا دیا ہے۔ پھر جو دلیل خود خدا نے مقرر کی ہو اس سے بڑھ کر دلیل اور کون سی ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف قرآن میں کہا گیا ہے کہ ھذا کتابنا ینطق علیکم بالحق (جاثیہ ۲۹) اور دوسری طرف کائنات کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ ماخلقنا ھما الا بالحق (دخان ۳۹) قرآن اور کائنات دونوں ایک ہی مشیت ربانی کا اظہار ہیں، ایک جگہ یہ اظہار لفظی صورت میں ہو رہا ہے اور دوسری جگہ عملی صورت میں۔

قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہی طریقہ خدا کے تمام پیغمبروں نے اختیار کیا۔ حضرت نوح علیہ السلام انتہائی قدیم زمانہ کے پیغمبر ہیں۔ مگر آنجناب کا طرز استدلال بھی ٹھیک وہی تھا جس کو آج ہم فطری یا حقیقی شواہد پر مبنی استدلال کہتے ہیں۔ سورۂ نوح کو دیکھئے۔ حضرت نوح کی زبان سے ارشاد ہوا ہے: فقلت استغفروا ربکم انہ کان غفارا۔ یرسل السماء علیکم مدرارا۔ ویمددکم باموال وبنین۔ ویجعل لکم جنات ویجعل لکم انہارا۔ مالکم لاترجون للہ وقارا۔ وقد خلقکم اطوارا۔ الم تروا کیف خلق اللہ سبع سماوات طباقا۔ وجعل القمر فیھن نورا وجعل الشمس سراجا۔ واللہ انبتکم من الارض نباتا۔ ثم یعیدکم فیھا

ویخرجکم اخراجا۔ واللہ جعل لکم الارض بساطاً لتسلکوا منھا سبلا فجاجا (نوح) اس کے بعد آپ قرآن کے دعوتی اسلوب کو دیکھئے تو اس میں بھی آپ کو ہر جگہ یہی طریقہ ملے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ سارا قرآن اسی اندازِ دعوت سے بھرا ہوا ہے جس کو ہم نے فطری انداز کہا ہے۔ مثلاً افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت۔ و الی السماء کیف رفعت۔ والی الجبال کیف نصبت والی الارض کیف سطحت (غاشیہ)

یہی اصل اسلامی استدلال ہے۔ یہی خدا کے تمام پیغمبروں نے اختیار کیا اور اسی سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے۔ مگر دوسری صدی ہجری میں عباسی خلافت کے زمانہ میں جب علوم اسلامی کی تدوین ہوئی تو بعض اتفاقی اسباب کے نتیجہ میں اسلامی علم کلام کو قدیم منطق و فلسفہ کی بنیاد پر مرتب کر دیا گیا۔ امام غزالی کے زمانہ میں یہی علم کلام اسلامی مدارس کے نصاب میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد نسل در نسل یہ سلسلہ چلتا رہا۔ حتیٰ کہ علم کلام ایک منطقی علم کے ہم معنی قرار پا گیا۔ مگر یہ قرآن سے سراسر انحراف تھا۔ یہ علم کلام اسلامی استدلال کی بنیاد قیاسی منطق پر رکھ رہا تھا جب کہ قرآن نے اسلامی استدلال کی بنیاد فطرت کے شواہد پر رکھی تھی۔ منطقی کلامیات کا لوگوں کے اوپر اتنا غلبہ ہوا کہ ایک ہزار سال تک بھی وہ اس سے باہر نہ آسکے۔ تاہم موجودہ زمانہ میں خود خارجی حالات ہم کو مجبور کر رہے ہیں کہ ہم اس کو چھوڑیں اور دوبارہ قرآن کے فطری اسلوب کی طرف واپس جائیں۔ سائنسی انقلاب سے پہلے یہ علم کلام کم از کم علمی حیثیت سے کچھ قدر و قیمت رکھتا تھا۔ مگر آج وہ علمی قدر و قیمت بھی کھو چکا ہے اور دعوتی افادیت جو پہلے بھی اس کے اندر موجود نہ تھی وہ اب اور زیادہ اس سے دور جا چکی ہے۔

جدید علم کلام، بالفاظ دیگر، قرآنی علم کلام کیا ہے۔ اس کو قرآنی آیات کے تتبع سے متعین کیا جا سکتا ہے۔ میں یہاں مختصر طور پر قرآنی کلامیات کے چند پہلوؤں کو بیان کروں گا۔ یہ پہلو قرآنی علم کلام کو جاننے کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۔ قرآنی کلامیات کے پہلے اصول کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل آیت پر غور کیجئے:

یسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا (اسراء ۸۵)

لوگ تم سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہو کہ روح خدا کے حکم سے ہے۔ اور تم کو صرف تھوڑا علم دیا گیا ہے

یہاں سوال کرنے والے نے ایک سوال کیا تھا اور وہ سوال کے جواب کا منتظر تھا۔ مگر اس کو کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ سوال کا جواب دینے کے بجائے خود سوال کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض سوالات ایسے ہوتے ہیں جن کا حقیقی جواب آدمی کے حدود فہم سے باہر ہوتا ہے۔ وہ ایسے جوابات کو اسی طرح نہیں سمجھ سکتا جس طرح ماں کے پیٹ کے اندر کا بچہ باہر کی دنیا کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس لئے جب کوئی شخص ایسے سوالات میں الجھے تو اس کی بہترین مدد یہ ہے کہ اس کو ایسے سوالات میں الجھنے سے روکا جائے۔ اس کے برعکس اگر جواب دینے والا

اس کا جواب دینے بیٹھ جائے تو وہ خود بھی بے راہ ہوگا اور سائل کو بھی بے راہ کرے گا۔

میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں ایک سوال میں بہت عرصہ سے الجھا ہوا ہوں، آپ اس کو حل کیجئے۔ پھر انھوں نے کہا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد ہی آدمی کے عمل کے مطابق اس کا عذاب و ثواب شروع ہو جاتا ہے۔ اب کوئی شخص ہے جو آج ساٹھ سال گزار کر مرجاتا ہے، کوئی شخص ہے جو دس ہزار سال پہلے اتنی ہی عمر گزار کر مرچکا ہے۔ یہ دونوں اگر جہنمی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یکساں برے عمل پر ایک شخص نے دوسرے کے مقابلہ میں دس ہزار سال زیادہ سزا پائی اور دونوں اگر جنتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یکساں اچھے عمل پر ایک شخص نے دوسرے کے مقابلہ میں دس ہزار سال زیادہ جنت کا لطف حاصل کیا۔ ایسی حالت میں تو خدا کو چاہئے تھا کہ وہ سب کو ایک وقت میں پیدا کرتا اور سب کو ایک وقت میں مارتا۔ تاکہ ہر ایک کو برابر جزا یا سزا ملے۔

اس قسم کے سوالات صرف ذہنی بے راہی کے سوالات ہیں۔ ہم ایک محدود دنیا میں رہتے ہیں۔ ہمارا ذہن زمان و مکان کی حدبندیوں میں رہ کر سوچتا ہے۔ ایسی حالت میں ہم اس دنیا کی حقیقتوں کو پوری طرح اپنی گرفت میں نہیں لاسکتے جو لامحدود ہے اور زمان و مکان کی حدبندیوں سے آزاد ہے۔ ایسی دنیا کے بارے میں ہم صرف اجمالی علم حاصل کرسکتے ہیں اور اس معاملہ میں ہمیں صرف اجمالی علم پر قناعت کرنا چاہئے۔ اس سے زیادہ کی خواہش کرنا صرف اپنے کو بے راہی کے خطرہ میں ڈالنا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو آیتیں اتاری ہیں وہ دو قسم کی ہیں۔ ایک محکمات، دوسری متشابہات۔ محکم آیتیں وہ ہیں جو ہماری معلوم دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایسے امور میں خدا نے براہ راست زبان میں اپنا حکم ارشاد فرمایا ہے۔ ان احکام کو ہم لفظی طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ جیسے یہ حکم کہ چور کا ہاتھ کاٹو (مائدہ ۳۸)۔ متشابہ آیتوں سے مراد متماثل آیتیں ہیں۔ یہ وہ آیتیں ہیں جن کا تعلق غیب کی دنیا سے ہے۔ ایسی آیتوں میں اللہ نے بات کو تمثیلی زبان (Symbolic Language) میں بیان کیا ہے جیسے یہ کہ اللہ تخت پر متمکن ہوا (اعراف ۵۴) محکم آیتوں میں تفصیلات اور تعینات تک پہنچنے کی کوشش کرنا مفید ہے۔ لیکن اگر اسی طرح متشابہ آیتوں میں تفصیلات اور تعینات تک پہنچنے کی کوشش کی جائے تو اس کا نتیجہ بھٹکنے کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔

علم کی یہ تقسیم فطرت کے عین مطابق ہے۔ جدید سائنس نے عالم فطرت کی جو تحقیق کی ہے اس نے انسانی علم کی محدودیت کو آخری طور پر ثابت کردیا ہے۔ جدید دنیا کا یہ مسلمہ ہے کہ انسان اپنی محدودیتوں کی وجہ سے اشیاء کا صرف جزئی علم حاصل کرسکتا ہے، وہ کلی علم تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس اعتبار سے قرآنی کلامیات کا پہلا اصول عین علمی اصول ہے۔ یہ وہ اصول ہے جس پر جدید ذہن خود اپنی تحقیق کے نتیجہ میں پہنچ چکا ہے۔

۲۔ قرآنی کلامیات کا دوسرا اصول حقائق فطرت سے استدلال ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم

ان کو آفاق کی اور انفس کی نشانیاں دکھائیں گے تاکہ لوگوں پر واضح ہوجائے کہ قرآن کی دعوت سراسر حق ہے۔ (حم سجدہ ۵۳) اس سلسلے میں یہاں چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں :

الف ۔ قرآن کی دعوت یہ ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے، اس کو مانو۔ اس دعوت کے حق میں دلیل کیا ہے۔ قدیم متکلمین نے اپنے فلسفیانہ ذوق کے تحت اس پر قیاسی دلیلیں قائم کیں۔ مگر قرآن اس کے حق میں مشاہداتی دلیل دیتا ہے۔ قرآن کا کہنا ہے کہ جو کائنات تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے اور جس کا تم انکار نہیں کرسکتے، وہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے :

اَوَلَمْ یَرَ الَّذِینَ کفروا اَنَّ السماواتِ والارضَ	کیا انکار کرنے والوں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین ملے
کانتا رَتْقاً ففتقنٰھما وجعلنا من الماء کل شیئٍ	ہوئے تھے پھر ہم نے ان کو کھول دیا اور ہم نے پانی سے
حیٍّ افلا یؤمنون (انبیاء ۳۰)	ہر جاندار کو بنایا، پھر کیا وہ ایمان نہیں لاتے

ان آیات میں واضح طور پر اس کائناتی واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس کو موجودہ زمانہ میں بگ بینگ نظریہ کہا جاتا ہے۔ خدا کی نگاہ میں اول سے آخر تک تمام انسان ہیں۔ وہ غیر زمانی انداز میں خطاب کرتے ہوئے تمام منکروں سے کہہ رہا ہے کہ ایک خدا کی دلیل خود اس کائنات میں موجود ہے جس کو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ پھر تم اس کا انکار کس طرح کرسکتے ہو۔

۱۹۱۲ میں امریکی عالم فلکیات وسٹو ملوین سلیفر (Vesto Melvin Slipher) نے لوویل آبزرویٹری میں تحقیق کرتے ہوئے پایا کہ کچھ کہکشائیں تیزی سے بیرونی سمت میں بھاگ رہی ہیں۔ اس کے بعد ایڈون ہبل (Edwin Hubble) اور ملٹن ہیومیسن (Milton Humason) نے ماؤنٹ ولسن کی سوانچ کی دوربین پر مشاہدہ کرکے بتایا کہ تمام کی تمام کہکشائیں اپنے بیرونی سمت میں تیزی سے چلی جارہی ہیں۔ پھر ڈچ عالم فلکیات ولیم ڈی سٹر (Willem de Sitter) نے اس نظریہ کے حق میں مزید تائیدی شواہد جمع کئے۔ ۱۹۶۵ میں نیوجرسی کے آرنو پنزیاز (Arno Penzias) اور ولسن (Robert Wilson) نے ابتدائی کائناتی دھماکہ کے دوران نکلی ہوئی بعض شعاعیں (Radiation) دریافت کیں۔ اس قسم کی مختلف دریافتوں کے بعد اب یہ نظریہ ایک ثابت شدہ حقیقت سمجھا جانے لگا ہے۔

اس نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ کائنات ہمیشہ سے نہیں ہے بلکہ وہ واضح طور پر اپنا ایک متعین آغاز رکھتی ہے۔ وہ ایک وقت خاص میں شروع ہوئی۔ یہ نظریہ بتاتا ہے کہ ہم ایک پھیلتی ہوئی کائنات میں ہیں۔ ہمارے چاروں طرف کہکشائیں بے حد تیزی سے بیرونی سمت میں بھاگ رہی ہیں۔ حساب سے معلوم ہوا ہے کہ اس بیرونی رفتار کو اگر اندر کی طرف لوٹایا جائے تو تقریباً ۲۰ ہزار ملین سال میں تمام پھیلی ہوئی کائنات سمٹ کر ایک گولا بن جائے گی۔ اس نظریہ نے

خدا کے وجود کو فطرت کے قانون کے ذریعہ ثابت کر دیا ہے کیونکہ ایک جمے ہوئے مادی گولے کے اندر ایک وقت خاص میں بیرونی سمت کی طرف مسلسل حرکت کسی خارجی محرک کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اس نظریہ پر ایک امریکی سائنس داں رابرٹ جیسٹرو (Robert Jastrow) کا مضمون شائع کرتے ہوئے ریڈرز ڈائجسٹ (اکتوبر ۱۹۸۰) نے اس کا عنوان ان الفاظ میں قائم کیا ہے: کیا فلکیاتی علما رخدا کو پا گئے ہیں:

Have Astronomers Found God

وہ سائنس داں جنھوں نے یہ عقیدہ بنا لیا تھا کہ کائنات کے ہر واقعہ کی اس طرح عقلی توجیہہ کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے ماضی کے کسی طبیعی واقعہ کا نتیجہ نظر آئے۔ ایسے لوگ اس دریافت سے بے حد گھبرا اٹھے کیونکہ اس سے کائنات میں طبیعی عمل اور ردعمل کے بجائے ایک زندہ خدا کی ارادی کارفرمائی نظر آتی تھی۔ حقائق کا انکار ان کے لئے ممکن نہ تھا، انھوں نے اس واقعہ کی اہمیت کو گھٹانے کے لئے اس کا نام بگ بینگ (بڑا دھماکہ) رکھ دیا۔ گویا کہ کائنات کا آغاز بس ایک بڑا پٹاخہ چھوٹنے کا معاملہ تھا اور بس۔ اسی قسم کے ایک امریکی عالم نے ایک مذہبی شخص سے مذاق کے انداز میں پوچھا کہ خدا نے جب زمین و آسمان نہیں بنائے تھے اس وقت وہ کیا کر رہا تھا۔ مذہبی شخص نے بگڑ کر جواب دیا کہ وہ ان لوگوں کے لئے جہنم تیار کرنے میں مشغول تھا جو اس قسم کے سوالات کرتے ہیں:

He was creating hell for people who asked questions like that

ب۔ قرآن کہتا ہے کہ موجودہ دنیا آخری دنیا نہیں، اس کے بعد ایک اور دنیا ہے۔ یہ دنیا اگرچہ آج ہم کو اپنی آنکھ سے دکھائی نہیں دیتی مگر وہ ایک مکمل حقیقت کے طور پر موجود ہے۔ قرآن کے اس دعوے کے حق میں بھی قدیم متکلمین نے فلسفیانہ قیاسات کے ذریعہ دلائل قائم کر لئے تھے۔ مگر قرآن نے اس کے حق میں ایسی دلیل پیش کی جس کو انسان اپنے تجرباتی علم کے ذریعہ جان سکتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

ومن کلّ شیءٍ خلقنا زوجین لعلکم تذکرون (ذاریات ۴۹) اور ہر چیز کو ہم نے جوڑا جوڑا بنایا تاکہ تم دھیان کرو یعنی جب ہر چیز اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر اپنی تکمیل کرتی ہے تو اس کائناتی قانون کے مطابق موجودہ دنیا کا بھی ایک جوڑا ہونا چاہئے جو اس کی تکمیل کرے۔ دنیا کے اسی جوڑے کا نام آخرت ہے۔

آدمی میں اور جانوروں میں جوڑے کا ہونا انسان کو قدیم ترین زمانہ سے معلوم تھا۔ پھر درختوں کے اندر جوڑے ہونے کا علم ہوا۔ تاہم ۱۹۲۸ تک یہ معلوم نہ تھا کہ جامد مادہ کا بھی جوڑا ہوتا ہے۔ اسی سال ریاضیاتی طبیعیات کے ایک عالم پال ڈیراک (Paul A.M. Dirac) نے مادی ذرہ کے ساتھ ایک نئے قسم کے غیر مرئی ذرہ کی موجودگی کا امکان ظاہر کیا۔ ۱۹۳۲ میں اینڈرسن (K. Anderson) نے کاسمک شعاعوں کے مطالعہ کے دوران معلوم کیا کہ الیکٹران کے ساتھ ایک اور ذرہ ہے جو اس کے مخالف برقی چارج رکھتا ہے۔ اس نئے ذرہ کا نام اینٹی

الکٹران رکھا گیا۔ یہ تحقیق آگے بڑھتی رہی۔ بالآخر معلوم ہوا کہ کائنات کے تمام ذرات جوڑوں (Pair Particles) کی شکل میں ہیں۔ پارٹکل کا اینٹی پارٹیکل، ایٹم کا اینٹی ایٹم، میٹر کا اینٹی میٹر، حتیٰ کہ ورلڈ کا اینٹی ورلڈ جیسا کہ ڈیراک نے ۱۹۳۳ میں بتایا۔

موجودہ زمانہ میں بہت سے سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اینٹی ورلڈ ہم سے الگ اور ہماری دنیا کے متوازی اپنا وجود رکھتا ہے۔ موجودہ دنیا میٹر کی ترکیب سے بنی ہے، اب کائناتی قانون کے مطابق ایک اور دنیا اینٹی میٹر سے ترکیب یافتہ موجود ہونا چاہئے۔ قیاس ہے کہ ۲۰ ہزار ملین سال پہلے جب بگ بینگ کا واقعہ ہوا تو اسی وقت فوٹان میٹر اور اینٹی میٹر کی دو مختلف صورتوں میں مجتمع ہو گئے اور ورلڈ اور اینٹی ورلڈ کو بنانے میں لگ گئے۔

اس نظریہ پر پہلے سویڈش طبیعیات داں اوسکر کلین (Osker Klein) اور طبیعی فلکیات داں ہینز الفوین (Hannes Alfven) نے کام کیا تھا۔ اور ۱۹۶۳ میں اپنے نتائج تحقیق پیش کئے۔ اس کے بعد سوویت ریاضی داں ڈاکٹر گستاف نان (Gustav Naan) نے اس کو مزید مستحکم کیا۔ ڈاکٹر گستاف نان کا کہنا ہے کہ اینٹی ورلڈ کو طبیعیات کے معلوم نظریات وقوانین کے ذریعہ پوری طرح بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا یقین ہے کہ اینٹی ورلڈ آج بھی موجود ہے مگر وہ ہم سے آزاد اور ہماری دنیا کے متوازی اپنا وجود رکھتا ہے۔ ہماری موجودہ دنیا میں تمام اینٹی پارٹیکل غیر قائم (Unstable) حالت میں ہیں۔ مگر اینٹی ورلڈ میں وہ سب قائم (Stable) حالت میں ہوں گے۔ کیونکہ تمام ایٹموں کے نیوکلیس منفی برقی چارج رکھتے ہوں گے اور تمام الکٹران مثبت برقی چارج۔

ج۔ اس سلسلہ میں ایک اور مثال لیجئے۔ قرآن میں فرعون کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

فالیوم ننجیک ببدنک لتکون لمن خلفک آیۃ وان کثیرا من الناس عن آیاتنا لغافلون	پس آج ہم تیرے جسم کو بچالیں گے تاکہ تو پیچھے آنے والوں کے لئے ایک نشان رہے۔ اور بہت سے لوگ ہیں جو ہماری نشانیوں سے غافل ہیں۔
یونس ۹۲	

اس آیت کے مطابق خدا نے فرعون کی لاش کو بعد کی نسلوں کی عبرت کے لئے محفوظ کر دیا تھا۔ ۱۸۹۸ کی بات ہے کہ مغرب کے ماہرین اثریات نے فرعون کی لاش کو قدیم مصری شہر تھیبس (Thebes) سے کھدائی کر کے نکالا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ حضرت موسیٰ کا سابقہ مصر کے دو فرعونوں سے ہوا تھا۔ آپ ریمسس دوم کے زمانہ میں پیدا ہوئے۔ مگر غرقابی کا واقعہ اس کے بعد اس کے بیٹے مرنفتاح (Merneptah) کے ساتھ پیش آیا۔ جس کا زمانہ تیرھویں صدی قبل مسیح ہے۔ دونوں فرعونوں کی ممی کی ہوئی لاش اب قاہرہ کے عجائب خانہ میں عام زیارت کے لئے موجود ہے۔ سائنسی جانچ سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ مرنفتاح وہی فرعون ہے جو حضرت موسیٰ کے زمانہ میں پانی میں غرق ہو کر مرا تھا۔

بائبل کا بیان ہے کہ فرعون ڈوب کر ختم ہوگیا۔ وہ اس کی لاش کی موجودگی کا کوئی اشارہ نہیں کرتی۔ تاریخ اس بارے میں مکمل طور پر خاموش ہے۔ قرآن کے نزول کے وقت اور اس کے بعد ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک انسان کو فرعون کی لاش کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ مگر قرآن کے کلام اللہ ہونے کی یہ کیسی عجیب شہادت ہے کہ موجودہ زمانہ میں حیرت انگیز طور پر اس کی لاش محفوظ حالت میں دریافت ہوگئی۔ ڈاکٹر موریس نے دس صفحات میں اس کی تفصیل دیتے ہوئے آخر میں لکھا ہے:

Those who seek among modern data for proof of the veracity of the Holy Scriptures will find a magnificent illustration of the verses of the Quran dealing with the Pharoah's body by visiting the Royal Mummies Room of the Egyptian Museum, Cairo

The Bible, The Quran and Science, 1976, P. 241

یعنی جو لوگ مقدس کتابوں کی سچائی کے لئے جدید ثبوت مانگتے ہیں وہ قرآن کی ان آیات کو پڑھیں اور اس کے بعد قاہرہ کے میوزیم میں شاہی ممیوں کے کمرہ کو دیکھیں تو وہ اس کی نہایت شان دار تصدیق پالیں گے۔

اس موضوع پر جو لوگ زیادہ تفصیلی مطالعہ کرنا چاہیں وہ ڈاکٹر موریس (Dr. Maurice Bucaille) کی کتاب دی بائبل دی قرآن اینڈ سائنس کا مطالعہ کریں۔ یہ اس موضوع پر ایک قابل قدر کتاب ہے۔ مصنف کو شوق تھا کہ وہ قرآن کے سائنسی بیانات کا جدید تحقیقات سے مقابلہ کریں۔ اس کے لئے انھوں نے برسوں تحقیق کی۔ صرف اسی مقصد سے عربی زبان سیکھی تاکہ قرآن کو براہ راست اس کی زبان میں سمجھ سکیں۔ اس کے بعد انھوں نے ڈھائی سو صفحات پر مشتمل مذکورہ کتاب شائع کی۔

ڈاکٹر موریس نے اپنی اس کتاب میں بہت سے سائنسی حقائق کا مقابلہ قرآن کے بیانات سے کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک قدیم کتاب کی جدید تحقیقات سے اس درجہ مطابقت اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ وہ بشری ذہن سے ماورا کسی ذہن سے نکلی ہو۔ وہ اپنی کتاب کو ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں:

In view of the level of knowledge in Mohammad's day, it is inconceivable that many of the statesments in the Quran which are connected with science could have been the work of a man. It is, moreover, perfectly legitimate, not only to regard the Quran as the expression of a Revelation, but also to award it a very special place, on account of the guarantee of authenticity it provides and the presence in it of scientific statements which, when studied today, appear as a challenge to explanation in human terms. (P. 252)

محمدؐ کے زمانہ میں علم کی جو سطح تھی اس کو دیکھتے ہوئے یہ بات بالکل ناقابل قیاس ہے کہ قرآن کے بہت سے بیانات جو سائنس سے تعلق رکھتے ہیں وہ کسی آدمی کے لکھے ہوئے ہوں۔ یہ بات پوری طرح معقول ہے کہ قرآن کو نہ صرف خدائی الہام کا ظہور سمجھا جائے بلکہ مزید اس کو ایک بہت امتیازی درجہ دیا جائے۔ قرآن اپنے مستند ہونے کی جو ضمانت

دیتا ہے اور اس کے اندر جو سائنسی بیانات ہیں، جب ان کا مطالعہ آج کیا جاتا ہے تو وہ قرآن کو انسانی کتاب قرار دینے کے خلاف ایک چیلنج معلوم ہوتے ہیں۔

۳۔ قرآنی کلامیات کا تیسرا اصول یہ ہے کہ کائنات کے اس پہلو کو نمایاں کیا جائے کہ خدا نے اس کو ہمارے لئے بطور میزان مقرر کیا ہے۔ قرآن کی دعوت یہ ہے کہ انسان خدا کی اطاعت کرے، وہ اپنے عجز کو محسوس کرتے ہوئے اپنے آپ کو اپنے خالق و مالک کے آگے ڈال دے۔ اس مطالبہ کے حق میں قرآن نے فلسفیانہ قسم کے دلائل نہیں قائم کئے بلکہ فطری انداز کے دلائل قائم کئے۔ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ایک آیت کا مطالعہ کیجئے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط و انزلنا الحدید فیہ بأس شدید ومنافع للناس ولیعلم اللہ من ینصرہ ورسلہ بالغیب ان اللہ قوی عزیز (حدید ۲۵)

ہم نے اپنے پیغمبروں کو نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ قائم رہیں انصاف پر۔ اور ہم نے لوہا اتارا اس میں بڑی قوت ہے اور لوگوں کے لئے فائدہ ہے۔ اور تاکہ اللہ جان لے کہ کون بے دیکھے اللہ کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ اللہ قوی اور زبردست ہے۔

میزان عربی زبان میں ترازو کو کہتے ہیں۔ یعنی وہ آلہ جس سے تول کر کسی چیز کی برابری کسی دوسری چیز سے معلوم کی جائے۔ پوری کائنات اس معنی میں خدا کی میزان ہے۔ کائنات کی ہر چیز کو خدا نے اسی حق و عدل کی بنیاد پر قائم کر رکھا ہے جس کا مطالبہ انسان سے کیا جا رہا ہے۔ کائنات کی تمام چیزیں جس عدل پر بجبر قائم ہیں اسی عدل پر انسان کو اپنے آزاد ارادہ سے قائم ہونا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے کتاب میں اپنی پسند کے تمام عادلانہ طریقے بتا دئے ہیں۔ دوسری طرف کائنات کو عملاً انھیں عادلانہ طریقوں پر قائم کر دیا ہے۔ اب انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ قرآن میں اصول عدل کو پڑھ کر اس سے رہنمائی حاصل کرے۔ اور اسی کے ساتھ کائنات کے ربانی پیمانہ سے ناپ کر دیکھتا رہے کہ اس کا طریقہ خدا کے پسندیدہ معیار کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں یہاں میزان کے طور پر لوہے کا ذکر کیا گیا ہے۔ لوہے کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے مومن کے بے خطا کردار کو تمثیل کیا ہے۔ موجودہ زندگی میں ہر قسم کا نفع قابل اعتماد کردار سے وابستہ ہے۔ مادہ کی دنیا میں یہی طاقت در کردار لوہے کا ہوتا ہے۔ انسان کی دنیا میں یہی طاقت در کردار خدا کو اپنے بندوں سے مطلوب ہے۔

اس سلسلہ میں ایک مثال شہد کی مکھی کی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کو حکم دیا کہ پہاڑوں اور درختوں میں اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں اپنے گھر بنا۔ پھر ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس۔ اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں میں چل۔ اس مکھی کے اندر سے پینے کی ایک چیز نکلتی ہے جس کے مختلف رنگ ہیں۔

اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔ اس واقعہ میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو دھیان دیتے ہیں (نحل)

شہد کی مکھی کا نظام ایک انتہائی جامع اور کامل قسم کا سماجی نظام ہے۔ اس میں وہ تمام اجزا پائے جاتے ہیں جو انسان کے بنائے ہوئے سماجی اور تمدنی نظام میں ہوتے ہیں۔ مگر شہد کی مکھیوں کا نظام ان تمام خرابیوں سے یکسر خالی ہوتا ہے جس کا شکار انسان کے سماجی اور تمدنی نظام ہمیشہ ہوا کرتے ہیں۔ شہد کی مکھی اپنی بستی بسانے کے لئے ایک جگہ کا انتخاب کرتی ہے۔ وہاں وہ ایک مکمل شہر بساتی ہے۔ وہ ایک انتہائی پیچیدہ قسم کا کارخانہ قائم کرتی ہے۔ وہ اپنے کارخانہ میں سیکڑوں میل سے ضروری سامان حاصل کرکے لاتی ہے۔ ہزاروں مکھیاں بیک وقت اپنے اپنے مقررہ کام میں لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان کی اس تنظیم اور اس جدوجہد کا آخری نتیجہ ایک قیمتی پیداوار (شہد) کی صورت میں برآمد ہوتا ہے جو اعلیٰ درجہ کی تیار غذا ہے اور اسی کے ساتھ انسانی امراض میں بہترین علاج بھی۔

شہد کی مکھیاں اتنا بڑا نظام چلاتی ہیں مگر وہ اپنی آبادکاری کے لئے کسی دوسرے کا گھر نہیں اجاڑتیں۔ وہ پھولوں کا رس لینے کے لئے پھولوں کو نہیں مسلتیں۔ ان کی اجتماعی جدوجہد میں کبھی باہمی ٹکراؤ کا واقعہ نہیں ہوتا۔ وہ اپنی محنت سے حاصل کی ہوئی پیداوار کا ایک قطرہ بھی ضائع نہیں کرتیں اور نہ اس کو اپنی چیز سمجھ کر سب کا سب اپنے اوپر خرچ کر ڈالتی ہیں۔ وہ اس کا بڑا حصہ دوسروں کی ضرورت کے لئے وقف کر دیتی ہیں۔ شہد کی مکھیوں کی دنیا میں ہر کام ٹھیک اسی طرح انجام دیا جاتا ہے جس طرح اسے انجام دیا جانا چاہئے۔ شہد کی مکھی خدا کے حکم سے اس بات کا عملی مظاہرہ کر رہی ہے کہ انسان کو اپنی سماجی زندگی کا نظام کس طرح بنانا چاہئے۔

اسی طرح تمام خدائی احکام کی تمثیل کائنات میں قائم کر دی گئی ہے (سجدہ کی تمثیل درخت کے سایہ کی صورت میں، قابل اعتماد کردار کی تمثیل لوہے کی صورت میں، تصادم کے بغیر سفر حیات کی تمثیل ستاروں کی اپنے اپنے مدار پر گردش کرنے کی صورت میں، اتحاد کار کی تمثیل شہد کی مکھیوں کے چھتہ کی صورت میں، اپنے اور غیر کو یکساں فیض پہنچانے کی تمثیل سورج کی روشنی کی صورت میں، وغیرہ) توحید اور اطاعت الٰہی کی طرف بلانے کے لئے قرآن کا یہ انداز عین فطری ہے۔ وہ ٹھیک اسی کائناتی استدلال پر قائم ہے جس پر جدید انسان نے اپنے علم وعمل کی پوری بنیاد کھڑی کی ہے۔ اگر ہم اس کو مؤثر طور پر آج کے انسان کے سامنے رکھ سکیں تو یقیناً ان میں سے بہت سے لوگ اسلام کو اپنے دل کی آواز پائیں گے۔ انسان چاند کے گھٹنے اور بڑھنے سے اپنا مہینہ اور سال شمار کرتا ہے۔ وہ زمین اور سورج کی حرکت سے اپنی گھڑیوں کا وقت مقرر کرتا ہے۔ وہ اپنی مشینوں کو قدرت کے نمونوں پر بناتا ہے (کشتی کو مچھلی کے نمونہ پر، ہوائی جہاز کو چڑیا کے نمونہ پر، کیمرہ کو آنکھ کے نمونہ پر، وغیرہ) اسی طرح وہ کائناتی اخلاقیات کو بھی اپنے اخلاق کے لئے معیار قرار دے سکتا ہے۔ بشرطیکہ ہم اس کو صحیح طور پر اس کے سامنے پیش کر دیں۔ اگر وہ کائنات سے اپنا مادی معیار لے رہا ہے تو اسی کائنات سے وہ اپنا اخلاقی معیار کیوں نہیں لے سکتا۔

۴۔ جدید علم کلام کا چوتھا اصول بات کو سادہ انداز میں کہنا ہے۔ سادہ انداز سے مراد حقیقت پسندی کا انداز ہے جس میں بات کو اس کے فطری ڈھنگ سے بیان کیا گیا ہو نہ کہ ادب کے تقاضوں کی بنا پر کسی قسم کے مصنوعی انداز میں۔

انسان کو خدا نے سادہ فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اس لئے جب بات کو سادہ انداز میں کہا جائے تو گویا گول خانہ میں گول چیز رکھی گئی۔ اس کے برعکس جب بات کو کسی قسم کے بناوٹی انداز میں کہا جائے تو یہ گول خانہ میں چوکھنٹی چیز رکھنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سادہ انداز میں کہی ہوئی بات انسانی فطرت کو اپیل کرتی ہے۔ وہ اس کے اندر داخل ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہ اس کی پوری ہستی میں سما جاتی ہے۔ اس کے برعکس جب بات کو مصنوعی اور پیچیدار انداز میں بیان کیا جاتا ہے تو وہ انسان کی ہستی میں نہیں سماتی، وہ اس کے اندرون کا جزء نہیں بنتی۔ وہ اِدھر اُدھر اٹک کر رہ جاتی ہے۔

قدیم زمانہ میں ادبی اسلوب ساری دنیا میں رائج تھا۔ کوئی اپنی بات کو شاعری کے اسلوب میں بیان کرتا تھا اور کوئی سجع کے اسلوب میں۔ کوئی تمثیل کے اسلوب میں اپنی بات پیش کرتا تھا اور کوئی کہانی کے اسلوب میں۔ موجودہ زمانہ میں ان اسالیب کی اہمیت بہت گھٹ گئی ہے۔ اب برتر اسلوب وہ سمجھا جاتا ہے جس میں بات کو واقعہ نگاری اور حقیقت بیانی کے انداز میں بیان کیا گیا ہو۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اسلوب جدید سائنسی انقلاب کی دین ہے۔ اسی لئے اس کو سائنسی اسلوب کہا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس اسلوب کا آغاز انسانی تاریخ میں پہلی بار قرآن نے کیا تھا۔

قرآن تاریخ کی پہلی معلوم کتاب ہے جس نے مصنوعی اسلوب کو چھوڑ کر فطری اسلوب میں بات کہنے کی بنیاد ڈالی۔ سائنسی اسلوب دراصل قرآنی اسلوب ہی کی ایک جدید شکل ہے۔ تاہم قرآن کے نزول کے سو برس بعد مسلمانوں کے درمیان قدیم منطق و فلسفہ کا رواج شروع ہو گیا۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ تقریباً تمام اسلامی علوم میں دوبارہ وہی مصنوعی انداز غالب آگیا جس کو قرآن نے ختم کیا تھا۔ لوگ اس کو کمال سمجھنے لگے کہ دین کی سادہ تعلیمات کو فنی موشگافیوں اور منطقی اصطلاحوں میں ڈھالیں اور اس کو منثور نظم یا منظوم نثر میں سجا کر پیش کریں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم دوبارہ قرآنی اسلوب کی طرف لوٹیں۔ آج کے انسان کے سامنے اسلام کی دعوت کو پیش کرنے کے لئے سائنسی اسلوب لازمی طور پر ضروری ہے۔ تاہم یہ سائنسی اسلوب خود قرآنی اسلوب ہی کا دوسرا نام ہے۔ سائنسی اسلوب کو اختیار کر کے ہم سادہ طور پر صرف قرآنی اسلوب کی طرف لوٹیں گے نہ کہ کوئی نئی چیز اختیار کریں گے۔

دارالعلوم حیدرآباد کے سمینار بعنوان "دینی تعلیم اور عصر حاضر کے تقاضے" کے موقع پر ۲۴ فروری ۱۹۸۱ کو پڑھا گیا۔

خدا کا انعام

آدمی کو چاہیئے کہ خدا سے اتنا قریب ہو جائے کہ ہر وقت اس کو خدا کی یاد آتی رہے۔ اللہ کی بڑائی کا احساس اس کے اوپر اتنا چھا جائے کہ اپنا وجود اس کو بے حقیقت نظر آنے لگے۔ جنت اور جہنم کا اس کو اتنا یقین ہو جائے کہ دنیا کے آرام و تکلیف سے زیادہ اس کو آخرت کے آرام و تکلیف کی فکر رہنے لگے۔ وہ اپنے آپ کو اتنا اوپر اٹھائے کہ اپنی غلطیاں اس کو اس طرح دکھائی دینے لگیں جس طرح کسی کو اپنے دشمن کی غلطیاں دکھائی دیتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو نفسیاتی گرہوں سے اتنا آزاد کر لے کہ اختلاف اور شکایت کے باوجود دوسرے کے لئے اس کے دل سے دعائیں نکلنے لگیں۔ حق کا اعتراف نہ کرنا اس کو ایسا معلوم ہو گویا وہ اپنے آپ کو قتل کر رہا ہے۔ دوسرے کا آشیانہ اجاڑنا اس کو ایسا لگے جیسے وہ خود اپنے آشیانہ میں آگ لگا رہا ہے۔ یہی خدا پرستی کی زندگی ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جن کو خدا اپنی جنت میں جگہ دے گا۔

جو لوگ اللہ کے سچے بندے بن جائیں، ان کے لئے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ دنیا میں انھیں غالب کرے گا۔ یہ غلبہ ان کی خدا پرستی کا اصل انعام نہیں بلکہ اصل انعام کی ابتدائی علامت ہے۔ خدا پرستوں کے لئے اللہ نے جو انعام مقدر کر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ قیامت کے بعد آنے والی دنیا میں وہ ان کو غلبہ و سربلندی عطا کرے۔ ان کو ہر قسم کے خوف اور حزن سے پاک کر کے اپنی رحمتیں اور نعمتیں دائمی طور پر ان کی وراثت میں دے دے۔ اسی کا نام جنت والی زندگی ہے جو آخرت میں مومنین صالحین کو حاصل ہوگی۔ مگر جب اہل ایمان کا کوئی قابل لحاظ گروہ بن جاتا ہے تو اللہ اس دنیا میں بھی اس کو علامتی طور پر غالب کر دیتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں سرکش اور غافل انسانوں کو مغلوب کر کے دکھایا جاتا ہے کہ آخرت کی ابدی دنیا میں کون عزت اور برتری کے مقام پر ہوگا اور کون ذلت اور پستی کے گڑھے میں ڈال دیا جائے گا۔

حقیقت کے مطابق

اسلام کیا ہے، فطرت کے مطابق زندگی گزارنا۔ دنیا میں اس طرح رہنا جیسا کہ حقیقت کے اعتبار سے آدمی کو رہنا چاہیے۔ آدمی خود سے نہیں بن گیا۔ اس کو خدا نے بنایا ہے۔ اب حقیقت کے مطابق زندگی یہ ہے کہ آدمی خدا کی بڑائی کو مانے اور اس کا احسان مند ہو۔ آدمی کے اندر ڈر اور محبت کے جذبات ہیں۔ وہ کسی چیز پر اعتماد کرنا چاہتا ہے اور کسی چیز کو اپنی دوڑ دھوپ کا مرکز بناتا ہے۔ اب حقیقت کے مطابق زندگی یہ ہے کہ آدمی ان حیثیتوں سے خدا کو اپنا مرکز بنائے۔ کیوں کہ دوسری تمام چیزیں مخلوق ہیں، خدا کے سوا کسی کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔

دنیا میں جتنے آدمی پیدا ہوئے یا پیدا ہوں گے سب کے باپ آدم ہیں، سب بالآخر ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ اس لئے حقیقت کے مطابق زندگی یہ ہے کہ ہر آدمی دوسرے کا خیر خواہ ہو، ہر ایک دوسرے کے ساتھ بھائیوں کا سا برتاؤ کرے۔ ہر آدمی کے اندر ضمیر ہے۔ یہ ضمیر انصاف کو پسند کرتا ہے اور ظلم اور بے انصافی کو ناپسند کرتا ہے۔ اب حقیقت کے مطابق زندگی یہ ہے کہ آدمی دوسروں کے درمیان اس طرح رہے کہ ہر آدمی دوسرے کا خیر خواہ ہو، ہر ایک دوسرے کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرے۔ آدمی پر ایک روز موت آنی ہے۔ موت ہر آدمی سے وہ چیز چھین لیتی ہے جو دنیا میں اس کو حاصل تھی۔ اس لئے حقیقت کے مطابق زندگی یہ ہے کہ دنیا کی اونچ نیچ کو وقتی اور مصنوعی خیال کیا جائے۔ ہر آدمی کو یکساں طور پر خدا کا بندہ سمجھا جائے خواہ بظاہر وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ اسی طرح آدمی کے سامنے ایک حق آتا ہے وہ اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ اس کا انکار کر دے۔ مگر وہ سوچتا ہے کہ ایک دن بالآخر ایسا آنے والا ہے جب کہ میں حق کو حق اور باطل کو باطل ماننے پر مجبور ہوں گا۔ یہ سوچ کر وہ اس حق کو آج ہی مان لیتا ہے جس کو وہ کل ماننے پر مجبور ہوگا۔

تین سو کی تعداد فیصلہ کن ہے

قریش میں ایک شخص جمیل بن معمر جمحی تھا۔ اس کو باتیں پھیلانے سے بہت دل چسپی تھی، اس کو معلوم ہوا کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کر لیا ہے تو اس نے بیت اللہ کے دروازہ پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا: الا ان ابن الخطاب قد صبأ (سنو خطاب کا لڑکا بے دین ہو گیا) قریش اس وقت کعبہ کے گرد اپنی مجلسوں میں تھے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا جواب دیا: کذب ولکنی قد اسلمت وشہدت ان لا الہ الا اللہ و محمد رسول اللہ (اس نے جھوٹ کہا۔ بلکہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں) اس کے بعد لوگ ان کے اوپر جھپٹ پڑے۔ وہ ان سے لڑتے رہے یہاں تک کہ سورج سر پر آ گیا۔ دونوں تھک کر بیٹھ گئے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا:

افعلوا ما بدا لکم فاحلف باللہ ان لو قد کنا ثلاث مائۃ رجل لقد ترکنا ھا لکم او ترکتموھا لنا (البدایہ والنہایہ، جلد ۳)	جو تمہارے جی میں آئے کر و۔ میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ اگر ہم مسلمان تین سو ہو جائیں تو پھر اس سر زمین کو یا ہم تمہارے لئے چھوڑ دیں گے یا تم اس کو ہمارے لئے چھوڑ دو گے

اسلام ان کے لئے طاقت بن گیا

نبوت کے پانچویں سال مسلمانوں نے مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ مکہ والوں کے مظالم سے تنگ آکر تقریباً اسی آدمی مختلف ٹولیوں میں حبشہ گئے۔ ان کے سردار جعفر بن ابی طالب تھے۔ قریش نے اپنا ایک وفد بھیج کر کوشش کی کہ نجاشی ان مہاجرین کو ان کے حوالے کر دے۔ مگر شاہ حبشہ (نجاشی) نے اس سے انکار کر دیا۔ وہ مسلمانوں کی باتوں اور ان کے طرز عمل سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے ان سے کہا: تم لوگ ہمارے ملک میں سیوم (مامون) ہو۔ جو تم کو برا کہے اس سے جرمانہ لیا جائے گا، جو تم کو برا کہے اس سے جرمانہ لیا جائے گا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ جو تم کو برا کہے اس سے جرمانہ لیا جائے گا۔ پہاڑ کے برابر سونا ملے تب بھی میں تم میں سے کسی پر زیادتی نہیں کروں گا۔ تم ہمارے ملک میں جب تک چاہے رہو"۔ اس نے مسلمانوں کو کھانا اور کپڑا دئے جانے کا حکم دیا۔ پھر اس نے پوچھا "کیا تم لوگوں کو کوئی ستاتا ہے"۔ مسلمانوں نے کہا ہاں۔ نجاشی نے منادی کرائی کہ جس نے مسلمانوں میں سے کسی کو ستایا تو ستانے والا اس مسلمان کو چار درہم جرمانہ دے۔ پھر مسلمانوں سے پوچھا کیا یہ کافی ہے۔ انھوں نے کہا نہیں۔ اس کے بعد اس نے جرمانہ کی رقم دگنی کر دی۔ ہجرت مدینہ کے بعد جب یہ مسلمان حبشہ سے واپس ہوئے تو نجاشی نے ان کو سواری اور زاد راہ دے کر رخصت کیا۔

موحد کے لئے دنیا میں سربلندی کا وعدہ ہے

نبوت کے بعد تقریباً دس سال تک ابو طالب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سرپرست تھے۔ ابو طالب جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو قریش کے سرداروں کی ایک جماعت ان کے گرد جمع ہوئی۔ ان میں ابوجہل بن ہشام، ابوسفیان بن حرب، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، امیہ بن خلف وغیرہ تھے۔ ان لوگوں نے ابو طالب سے کہا: آپ کا ہمارے درمیان جو مقام ہے وہ آپ جانتے ہیں۔ اور آپ پر وہ وقت آچکا ہے جو سب پر آتا ہے۔ آپ کے بھتیجے اور ہمارے درمیان

جو بات ہے اس کو آپ جانتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ان کے بارے میں ہم سے عہد لے لیں اور ہمارے بارے میں ان سے عہد لے لیں۔ تاکہ وہ ہم سے رک جائیں اور ہم ان سے رک جائیں۔ وہ ہم کو ہمارے دین پر چھوڑ دیں اور ہم ان کو ان کے دین پر چھوڑ دیں۔ ابو طالب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور کہا کہ اے میرے بھتیجے! یہ قوم کے سردار ہیں۔ یہاں آئے ہیں تاکہ تم کو کچھ قول دیں اور تم سے کچھ قول لیں۔ تو تم ان سے کیا چاہتے ہو۔ آپ نے فرمایا:

کلمۃ واحدۃ تعطونیھا تملکون بھا العرب و تدین لکم بھا العجم (البدایہ والنہایہ)

تم لوگ میری ایک بات مان لو۔ اس سے تم عرب کے مالک بن جاؤ گے اور عجم تمہارے مطیع ہو جائیں گے۔

ابوجہل نے کہا، تمہارے باپ کی قسم ہم دس بات کے لئے تیار ہیں۔ آپ نے فرمایا: "لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرو، اللہ کے سوا جن کی پرستش کرتے ہو ان کو نکال پھینکو۔" یہ سن کر انھوں نے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور یہ کہتے ہوئے چلے گئے: کیا ہم تمام معبودوں کو چھوڑ کر ایک معبود کی پرستش کریں۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہوگی۔ یہ شخص تم کو کچھ دینے والا نہیں۔ چلو اپنے دین پر قائم رہو یہاں تک کہ اللہ تمہارے اور اس کے درمیان کوئی فیصلہ کر دے۔

جاندار افراد ہوں تو تھوڑے بھی بہت ہیں

ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چار ساتھی بہترین ساتھی ہیں۔ دعوتی گروہ کے لئے چار سو کی تعداد بہترین تعداد ہے۔ بہترین لشکر چار ہزار کا لشکر ہے۔ اور اگر بارہ ہزار آدمی ہوں تو وہ محض قلت کی وجہ سے کبھی مغلوب نہیں ہو سکتے۔ یعنی وہ ہاریں گے تو اس کی وجہ قلت نہیں ہوگی، کوئی اور ہوگی (خیر الصحابۃ اربعۃ وخیر السرایا اربع مأۃ وخیر الجیوش اربعۃ آلاف ولن یُغلب اثنا عشر الفا من قلۃ، ریاض الصالحین ۹۵۸)

دشمن کے خلاف کامیاب کارروائی کے لئے پردہ داری ضروری ہے

قریش نے معاہدۂ حدیبیہ کی خلاف ورزی کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاد کی تیاری میں مصروف ہو گئے:

امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الناس بالجھاز و امر اھلہ ان یجھزوہ فدخل ابوبکر علی ابنتہ عائشۃ رضی اللہ عنھا وھی تحرک بعض جھاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال ای بنیۃ امرکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان تجھزوہ قالت نعم۔ قال فاین ترینہ یریدقالت واللہ لا ادری

(سیرت ابن ہشام جلد ۴ صفحہ ۱۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو سفر کی تیاری کا حکم دیا اور اپنے اہل خانہ سے کہا کہ وہ آپ کا سامان سفر درست کریں۔ پھر حضرت ابوبکر اپنی صاحب زادی حضرت عائشہ کے یہاں آئے اور وہ آپ کے سامان سفر کی تیاری میں مشغول تھیں۔ انھوں نے کہا اے میری بیٹی کیا تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سامان سفر تیار کرنے کا حکم دیا ہے حضرت عائشہ نے کہا ہاں۔ انھوں نے پوچھا تمہارا کیا خیال ہے۔ آپ کہاں کے سفر کا ارادہ رکھتے ہیں۔ حضرت عائشہ نے کہا خدا کی قسم مجھے نہیں معلوم۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیار اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپے یا ماہانہ ساڑھے سات روپے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

۱۔	الاسلام		از مولانا وحید الدین خاں		۱۵—۰
۲۔	مذہب اور جدید چیلنج	..	〃	..	۱۵—۰
۳۔	ظہور اسلام	..	〃	..	۱۵—۰
۴۔	دین کیا ہے	..	〃	..	۲—۰
۵۔	قرآن کا مطلوب انسان	..	〃	..	۵—۰
۶۔	تجدید دین	..	〃	..	۳—۰
۷۔	اسلام دین فطرت	..	〃	..	۳—۰
۸۔	تعمیر ملت	..	〃	..	۲—۰
۹۔	تاریخ کا سبق	..	〃	..	۲—۰
۱۰۔	مذہب اور سائنس	..	〃	..	۵—۰
۱۱۔	عقلیات اسلام	..	〃	..	۲—۰
۱۲۔	فسادات کا مسئلہ	..	〃	..	۲—۰
۱۳۔	انسان اپنے کو پہچان	..	〃	..	۱—۰
۱۴۔	تعارف اسلام	..	〃	..	۲—۵۰
۱۵۔	اسلام پندرھویں صدی میں	..	〃	..	۲—۰
۱۶۔	راہیں بند نہیں	..	〃	..	۳—۰
۱۷۔	دینی تعلیم	..	〃	..	۳—۰
۱۸۔	ایمانی طاقت	..	〃	..	(زیر طبع)
۱۹۔	اتحاد ملت	..	〃	..	
۲۰۔	سبق آموز واقعات	..	〃	..	
۲۱۔	اسلامی تاریخ سے	..	〃	..	
۲۲۔	قال اللہ	..	〃	..	
۲۳۔	اسلامی دعوت	..	〃	..	۳—۰۰
۲۴۔	زلزلۂ قیامت	..	〃	..	۴—۰۰
۲۵۔	سچا راستہ	..	〃	..	۱—۰۰

عربی مطبوعات

مولانا وحید الدین خاں کی کتابوں کے بعض عربی ترجمے (مطبوعہ قاہرہ) برائے فروخت مکتبہ الرسالہ میں موجود ہیں:

۱۔ الإسلام يتحدى	۲۶۳	صفحات	قیمت	۲۰	روپے
۲۔ الدين في مواجهة العلم	۱۱۲	صفحات	"	۱۰	روپے
۳۔ حكمة الدين	۸۷	صفحات	"	۸	روپے
۴۔ الإسلام والعصر الحديث	۷۷	صفحات	"	۸	روپے
۵۔ مسئوليات الدعوة	۳۹	صفحات	"	۲	روپے
۶۔ نحو تدوين جديد للعلوم الإسلامية	۲۶	صفحات	"	۲	روپے
۷۔ إمكانات جديدة للدعوة	۳۴	صفحات	"	۲	روپے
۸۔ الشريعة الإسلامية وتحديات العصر	۳۲	صفحات	"	۲	روپے
۹۔ المسلمون بين الماضي والحال والمستقبل	۷۲	صفحات	"	۵	روپے
۱۰۔ نحو بعث إسلامي	۳۲	صفحات	"	۵۰	پیسے

اعلان

ہندستان میں مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی شائع کردہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور دیگر مصنفین کی کتابوں کے شائقین مکتبہ الرسالہ دہلی سے رابطہ قائم فرمائیں انشاء اللہ ان کی فرمائشیں پوری کردی جائیں گی۔ مذکورہ کتابوں کی قیمت ہندستان کے لئے ان کی اصل مطبوعہ قیمت کی دگنا ہوگی۔

ماہنامہ میثاق لاہور (زیر ادارت ڈاکٹر اسرار احمد صاحب) کا ہندستان کے لئے زر تعاون پچاس روپے سالانہ ہے۔ جو لوگ جاری کرانا چاہیں وہ مکتبہ الرسالہ دہلی میں رقم جمع کرا کے اس کی رسید ماہنامہ میثاق لاہور کے نام بذریعہ ڈاک بھیج دیں۔ میثاق ان کے نام جاری ہو جائے گا۔

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

REGD. NO. D. (DN) 532
REGD. R. N. NO. 28822/76

M A Y 1981
ISSUE NO. 54

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

۷۰ سال سے
لوگوں کا من پسند
شربت

شربت رُوح افزا ۷۰ سالوں سے لوگوں کو گرمی کے
دنوں میں ٹھنڈک اور تراوٹ پہنچاتا آرہا ہے۔
یہ بدن کو قدرتی تازگی دینے والی سولہ جڑی بوٹیوں
اور پھولوں پھلوں کے خالص رس سے بنتا ہے۔
شربت رُوح افزا پیاس ہی نہیں بجھاتا بلکہ
آپ کے جسم کو گرمی کا
مقابلہ کرنے کی طاقت دیتا ہے۔
اِسے آپ چینی کی جگہ ٹھنڈے پانی،
دودھ یا دہی کی لسی اور آئس کریم میں ڈالیے اور
بھرپور فرحت بخش لذت حاصل کیجیے۔

شربت رُوح افزا
لاجواب چیز ہے

ہمدرد

HTD-HWL-6741